قرآن کالج لاہور

کے زیر اہتمام

میٹرک کے امتحانات سے فارغ طلبہ کے لئے

اسلامک جنرل نالج ورکشاپ

- آغاز کلاس : 11 مئی 1998ء
- دورانیہ : ایک ماہ
- اوقات : 7 : 30 تا 11 : 30
- مضامین : ۱) تجوید و ناظرہ ۲) مطالعۂ قرآن حکیم ۳) ابتدائی عربی ۴) تعارف ارکان اسلام، مسائل نماز ۵) کمپیوٹر
- کورس کے اختتام پر کامیاب طلبہ میں اسناد تقسیم کی جائیں گی۔
- ہاسٹل کی محدود سہولت دستیاب ہے۔

191 ۔ اتاترک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور ۔ فون : 5833637

وَمَن يُؤتَ الحِكمَةَ فَقَد أُوتِيَ خَيرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے پی ایچ ڈی ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون: حافظ عاکف سعید ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: حافظ خالد محمود خضر، پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی

جلد ۱۷ | محرم الحرام ۱۴۱۹ھ — مئی ۱۹۹۸ء | شمارہ ۵

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴۔ فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شادی ہال، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زر تعاون -/۸۰ روپے، فی شمارہ -/۸ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور

درس ۱۰

تعمیر سیرت کی اساسات

اور قرآن کا انسان مطلوب

سورۃ المومنون اور سورۃ المعارج کی روشنی میں

(۲)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ — بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ اَلَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِھِمْ خٰشِعُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوْنَ ○ ﴾

وقال تبارك وتعالٰی فی سورۃ المعارج :

﴿ وَالَّذِیْنَ فِیْ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ○ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○ وَالَّذِیْنَ یُصَدِّقُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ ○ وَالَّذِیْنَ ھُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّھِمْ مُّشْفِقُوْنَ ○ اِنَّ عَذَابَ رَبِّھِمْ غَیْرُ مَاْمُوْنٍ ○ ﴾ —— صدق اللّٰہ العظیم

انسان کی سیرت و کردار کی تعمیر کے ضمن میں جو اساسی پروگرام قرآن حکیم ہمیں دیتا ہے' اس کے جزوِ اول کے بارے میں' جو اس لائحہ عمل کا اہم ترین جزو ہے' ہم نے سورۃ المومنون اور سورۃ المعارج کی آیات میں یہ دیکھا کہ دونوں جگہ کامل مطابقت ہے' کہ دونوں مقامات پر اولاً بھی صلوٰۃ کا ذکر آیا اور اختتام بھی صلوٰۃ پر ہوا۔ پھر یہ کہ دونوں مقامات پر صلوٰۃ کی محافظت پر بہت زیادہ زور دیا گیا۔ سورۃ المومنون میں خشوع و خضوع کی طرف توجہ دلائی گئی اور سورۃ المعارج میں مداومت کی طرف متوجہ کیا گیا۔ ان تمام چیزوں کو جمع کر لیا جائے تو اس سے اقامتِ صلوٰۃ کی اصطلاح وجود میں آتی ہے۔ چنانچہ ہم بعد کی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حرفِ اول

۱۹۸۰ء کی دہائی میں قرآن اکیڈمی لاہور میں دینی تعلیم کے دو سالہ کورس کا اجراء ہوا۔ اس کورس میں تعلیمِ قرآن کے لئے عربی صرف و نحو کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی۔ استاذِ مکرم پروفیسر حافظ احمد یار صاحب رحمہ اللہ نے اپنی زندگی بھر کے تعلیمی و تدریسی تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کورس پر اپنی پوری توجہات مرکوز کر دیں' اور شرکائے کورس کو پہلے ٹھوس بنیادوں پر عربی صرف و نحو کے قواعد ذہن نشین کرانے کے بعد' لغوی اور نحوی بنیادوں پر پورے قرآن حکیم کا ترجمہ سبقاً سبقاً کرایا۔ اس دوران مختلف اردو تراجم قرآن کا تقابلی مطالعہ بھی سامنے آتا رہا۔ ترجمہ قرآن کریم کی اس تدریس کے دوران حافظ صاحب مرحوم و مغفور کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اردو زبان میں "لغات و اعراب قرآن" کے موضوع پر ایک جامع کتاب لکھی جائے جس کے اندر کلاس میں کئے گئے اجمالی کام کی تفصیل آ جائے ـــــ اور پھر مختلف جسمانی عوارض اور پیرانہ سالی کے علی الرغم حافظ صاحبؒ نے اپنے عزم و حوصلہ کی بنیاد پر اس انتہائی کٹھن کام کا بیڑا اٹھالیا۔ اس کے بعد حافظ صاحبؒ پوری توجہ سے اس کام میں مصروف ہو گئے اور قرآن میں غوطہ زن ہونے کے خواہش مند طالبانِ قرآن کو اس بحرِ کی غواصی کے رموز سے آشنا کرتے رہے۔ تا آنکہ گزشتہ سال حافظ صاحب داعی اجل کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!

"لغات و اعرابِ قرآن" کا مقدمہ دو اقساط میں جنوری اور فروری ۱۹۸۹ء کے حکمت قرآن میں شائع ہوا تھا اور اس کے بعد سے آج تک یہ سلسلہ قریباً باقاعدگی سے جاری رہا ہے۔ پیش نظر شمارے میں سورۃ البقرہ کی آیات ۱۰۹' ۱۱۰ پر مشتمل بحث کا آغاز ہو رہا ہے جو آئندہ دو شماروں میں پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے پاس موجود حافظ صاحب مرحوم و مغفور کا مکمل کیا ہوا "لغات و اعرابِ قرآن" کا کام ختم ہو جائے گا۔ اس مرحلہ پر اب کسی جواں ہمت صاحب علم کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی ہے جو اس کام کو انہی خطوط پر آگے بڑھا سکے۔ حکمت قرآن کے قارئین میں یقیناً بہت سے اصحاب علم و فضل بھی ہیں۔ ان میں سے اگر کوئی صاحب اپنے اندر اس کام کی صلاحیت اور عزم و ولولہ پاتے ہوں تو وہ قدم آگے بڑھائیں' تاکہ اس مفید علمی کام کا سلسلہ منقطع نہ ہونے پائے۔ OO

درس ۱۰

تعمیر سیرت کی اساسات

اور قرآن کا انسان مطلوب

سورۃ المومنون اور سورۃ المعارج کی روشنی میں

(۲)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ — بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ اَلَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِھِمْ خٰشِعُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوْنَ ○ ﴾

وقال تبارك وتعالٰی فی سورۃ المعارج :

﴿ وَالَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ○ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○ وَالَّذِیْنَ یُصَدِّقُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ ○ وَالَّذِیْنَ ھُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّھِمْ مُّشْفِقُوْنَ ○ اِنَّ عَذَابَ رَبِّھِمْ غَیْرُ مَاْمُوْنٍ ○ ﴾ —— صدق اللّٰہ العظیم

انسان کی سیرت و کردار کی تعمیر کے ضمن میں جو اساسی پروگرام قرآن حکیم ہمیں دیتا ہے' اس کے جزوِ اول کے بارے میں' جو اس لائحہ عمل کا اہم ترین جزو ہے' ہم نے سورۃ المومنون اور سورۃ المعارج کی آیات میں یہ دیکھا کہ دونوں جگہ کامل مطابقت ہے' کہ دونوں مقامات پر اولاً بھی صلوٰۃ کا ذکر آیا اور اختتام بھی صلوٰۃ پر ہوا۔ پھر یہ کہ دونوں مقامات پر صلوٰۃ کی محافظت پر بہت زیادہ زور دیا گیا۔ سورۃ المومنون میں خشوع و خضوع کی طرف توجہ دلائی گئی اور سورۃ المعارج میں مداومت کی طرف متوجہ کیا گیا۔ ان تمام چیزوں کو جمع کر لیا جائے تو اس سے اقامتِ صلوٰۃ کی اصطلاح وجود میں آتی ہے۔ چنانچہ ہم بعد کی

سورتوں میں قرآن حکیم میں اسی اصطلاح کو دیکھتے ہیں' مثلاً : "اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" اور "وَالَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ"۔

اس پروگرام کے دوسرے اور تیسرے اجزاء (اعراض عن اللّغو اور زکوٰۃ) کے ضمن میں ہمیں دو باتیں نظر آتی ہیں جن کا دونوں سورتوں میں تذکرہ ہو رہا ہے۔ ان میں ایک تو ترتیب عکسی ہے' یعنی سورۃ المومنون میں پہلے اعراض عن اللّغو کا ذکر ہے اور بعد میں زکوٰۃ اور تزکیہ کا ـــــ جبکہ سورۃ المعارج میں پہلے زکوٰۃ اور تزکیہ کا ذکر ہے اور پھر ایمان بالآخرہ اور ایمان بالقیامہ کا' جس کا اعراض عن اللغو سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان دونوں اوصاف کے بیان میں دونوں مقامات پر تعبیر کے لئے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ قدرے مختلف ہیں اور ان سے ہمیں ان دونوں کی اصل حقیقت اور اصل روح کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

لغو کاموں سے پرہیز

ہم اِس وقت سورۃ المومنون کی ابتدائی آیات کی ترتیب کے مطابق گفتگو کریں گے۔ اس میں مُفلِحین کا جو دوسرا وصف آیا ہے وہ "اِعراض عَنِ اللَّغو" ہے ـــــ لغو کا مفہوم معصیت یا گناہ نہیں ہے بلکہ وہ کام مراد ہے جو خواہ فی نفسہٖ مباح ہو' اس کی شریعت میں ممانعت نہ ہو' لیکن انسان کو اس کا کوئی فائدہ نہ پہنچتا ہو۔ قرآن مجید انسان کے وقت کی قدر و قیمت کے معاملہ پر بہت زور دیتا ہے اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے کہ یہی انسان کا اصل سرمایہ اور راس المال ہے۔ اس وقت ہی سے انسان کو بنانا ہے جو کچھ بھی بنانا ہے اور اس وقت ہی میں بننا ہے جو کچھ بھی بننا ہے۔ لہٰذا اس وقت کی قدر و قیمت کا احساس ہونا چاہئے۔ یہ وقت یا تو کسی حقیقی دنیوی ضرورت کو پورا کرنے میں صرف ہو' یا اس کے ذریعہ سے آخرت کے لئے کوئی کمائی کی جائے۔ ہر وہ کام جس سے نہ تو کوئی دنیوی ضرورت حاصل ہو رہی ہو اور نہ اس کے ذریعے انسان آخرت کے لئے کوئی کمائی کر رہا ہو تو ایسا کام "لغو" شمار ہو گا' خواہ وہ ممنوعات کی فہرست میں شامل نہ ہو' وہ حرام و ناجائز نہ ہو' وہ معصیت اور گناہ نہ ہو۔ اس حقیقت کو نبی اکرم ﷺ نے بایں

الفاظ بیان فرمایا : ((مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهٗ مَالَا یَعْنِیْهِ)) یعنی انسان کے دین اور اسلام کے حسن و خوبی میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ وہ ہر اُس چیز کو ترک کر دے جو لایعنی ہو' جس کا اسے کوئی فائدہ نہ پہنچ رہا ہو۔ تو ہر لایعنی اور غیر مفید کام کو چھوڑ دینا "اعراض عن اللّغو" ہے۔

اب آپ غور کیجئے کہ اصل میں اس کا گہرا تعلق ہمارے تصورِ حیات سے ہے۔ اگر کوئی شخص دنیا کی زندگی کے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ بس یہی کل زندگی ہے' کوئی بعث بعد الموت اور آخرت نہیں' کوئی جزا و سزا نہیں' پھر تو ظاہر بات ہے کہ اپنی معاشی ضروریات سے جو وقت بھی بچ رہا ہو گا وہ اس کا کوئی مصرف تلاش کرے گا کہ کوئی Hobby اور مشغلہ ہو' کوئی Amusement اور تفریح ہو' وقت گزاری (to pass time) کے لئے کوئی شغل ہو۔ لیکن اُس شخص کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے جسے اس بات کا یقین ہے کہ دراصل اس دنیا کی زندگی تو ایک دیباچہ اور مقدمہ ہے' اصل کتاب زندگی تو موت کے بعد کھلے گی : ﴿ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ' لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ (العنکبوت : ۶۴) "اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے اصل گھر تو آخرت کا گھر ہے' کاش انہیں معلوم ہوتا"۔ نبی اکرم ﷺ کی بڑی پیاری حدیث ہے جس میں حضورؐ نے وہ نتیجہ بیان فرمایا جو اس حقیقت کے انکشاف سے برآمد ہوتا ہے۔ فرمایا الصادق والمصدوق ﷺ نے : ((اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ)) "دنیا آخرت کی کھیتی ہے" ـــــ یہاں بوؤ گے تو وہاں کاٹو گے ـــــ ظاہر بات ہے کہ دنیا کے بارے میں یہ حقیقت منکشف ہونے کے بعد اب اس دنیا کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہو گیا۔ ہمیں اس میں بونا ہے تاکہ اسے ہم آخرت میں کاٹ سکیں۔ لہٰذا جس کے دل میں یہ ایمان بالآخرۃ ہو گا وہ اپنے وقت کی جس طرح قدر و قیمت کا احساس کرے گا ایسا اُس شخص کا معاملہ نہیں ہو سکتا جو آخرت پر یقین نہیں رکھتا۔ سورۃ العصر جہاں سے ہمارے اس سلسلۂ درس کا آغاز ہوا' اس میں ہم نے جو پہلا لفظ پڑھا وہ ہے ﴿ وَالْعَصْرِ ۝ ﴾ "زمانہ کی قسم ہے"۔ یہ زمانہ تیزی سے گزرا جا رہا ہے۔ یہی تمہارا راس المال ہے۔ اس کے بارے میں ایک مفسر نے بڑی عبرت انگیز مثال پیش کی ہے کہ برف کا ایک تاجر چلاتا ہے کہ لوگو! رحم کرو! اگر میرا یہ برف فروخت نہ ہوا

تو میرا جو راس المال ہے وہ پگھل جائے گا۔ میں یہ بات ہنری ورڈزورتھ کی ایک نظم Psalm of life کے حوالے سے بیان کیا کرتا ہوں جس میں شاعر نے اس حقیقت کی بڑی خوبصورتی سے عکاسی کی ہے :

Art is long and time is fleeting
And our hearts though stout and brave
Still, like muffled drums are beating
Funeral marches to the grave

اس وقت کی قدر کرو' یہ بڑی تیزی سے گزر رہا ہے۔ اور جس طرح کسی اہم فوجی شخصیت کا جنازہ ڈھول کی ہر ضرب کے ساتھ قبر سے نزدیک تر ہوتا جاتا ہے اسی طرح ہمارے دل کی ہر دھڑکن گویا ہمیں ہماری قبر سے قریب تر کر رہی ہے۔

یہ احساس اگر سامنے ہو تو معلوم ہو گا کہ وقت کی کیا قدر و قیمت ہے! لہٰذا یہاں تعمیرِ سیرت کے ذیل میں جو دوسرا وصف بیان ہوا وہ ہے "اِعراض عَنِ اللّغو" اور اس پر سورۃ المعارج کے ان الفاظ سے روشنی پڑی : ﴿وَالَّذِیْنَ یُصَدِّقُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ ۝﴾ "وہ لوگ جو روزِ جزا کی تصدیق کرتے ہیں"۔ قیامت کے دن کو مانتے ہیں ﴿وَالَّذِیْنَ ھُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّھِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝﴾ "اور وہ لوگ جو اپنے رب کے عذاب کے خیال سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں"۔ اور واقعہ یہ ہے کہ : ﴿اِنَّ عَذَابَ رَبِّھِمْ غَیْرُ مَاْمُوْنٍ ۝﴾ "بے شک ان کے رب کا عذاب چیز ہی ایسی ہے جس سے بے خوف اور نچنت ہوا ہی نہیں جا سکتا۔"

زکوٰۃ پر کاربند رہنا

تیسرا وصف سورۃ المومنون میں یہ بیان ہوا : ﴿وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوْنَ ۝﴾ "اور وہ لوگ جو زکوٰۃ پر کاربند رہتے ہیں" ـــــ میں نے پہلے بھی توجہ دلائی تھی کہ جب قرآن مجید میں زکوٰۃ کا ایک اصطلاح کے طور پر ذکر ہوتا ہے تو اس کے ساتھ فعل اِیتاء آتا ہے مثلاً اِیتاءِ الزَّکٰوۃِ' یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ' اٰتَی الزَّکٰوۃَ' اٰتُوا الزَّکٰوۃَ ـــــ لیکن یہاں اسلوب مختلف ہے۔ یہاں فرمایا گیا : ﴿وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوْنَ ۝﴾ ـــــ اس میں ایک تو

دراصل زکوٰۃ کی بنیادی حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی اور دوسرے یہ کہ "فَاعِلُونَ" فرما کر اس بات کو واضح کیا گیا کہ وہ لوگ یہ عمل مسلسل کرتے رہتے ہیں ـــــ یہاں اس بات کو جان لیجئے کہ زکوٰۃ کا اصل مفہوم اور اس کی بنیادی حقیقت کیا ہے! جیسے "ف ل ح" کے مادے سے ہم نے فلاح کا مفہوم سمجھا تھا ایسے ہی "ز ک ی" کے حوالے سے ہمیں اس کا اصل مفہوم سمجھنا ہو گا۔ اسے آپ ایک مالی کے عمل پر قیاس کر کے بخوبی سمجھ سکیں گے جس نے ایک باغیچہ لگایا ہے' جس میں کچھ پودے اُس نے خود لگائے ہیں جو پھل دار ہیں' یا پھول دار ہیں۔ لیکن اسی باغیچہ میں خود رَو گھاس اور کچھ جھاڑ جھنکاڑ بھی اپنے آپ اُگ آتا ہے اور یہ خود رَو گھاس یا جھاڑ جھنکاڑ اِن پودوں کے نشوونما میں رکاوٹ بنتا ہے۔ زمین میں جتنی قوت نمو ہے اسے اگر یہ خود رَو گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ نہ کھینچ رہے ہوں تو یہ ساری قوت نمو اُن پودوں کو ملے گی جو اس مالی نے خود لگائے ہیں' ورنہ یہ گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ بھی اس میں سے اپنا حصہ وصول کریں گے۔ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ یہ خود رو چیزیں ان پودوں کے لئے ہوا کی آکسیجن اور سورج کی تمازت حاصل کرنے سے رکاوٹ بن رہی ہوں۔ لہٰذا مالی اپنے کھرپے کے ذریعے سے' جو ہر وقت اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے' اس باغیچہ کے اندر سے تمام خود رو گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ کو علیحدہ کر دے گا۔ مالی کا یہ عمل "تزکیہ" ہے۔ چنانچہ اس کا اصل مفہوم یہ ہوا کہ کسی شے کی نشوونما میں جو رکاوٹ ہو اس کو دور کر دینا تزکیہ ہے۔

اب اس بات کو جان لیجئے کہ ہر انسان' ہر فرد نوع بشر اللہ تعالیٰ کی کیاری کا ایک پودا ہے جو اس نے لگایا ہے۔ چنانچہ اللہ چاہتا ہے کہ یہ پروان چڑھے' پھلے پھولے' اس میں جو استعدادات اللہ نے ودیعت کی ہیں وہ پورے طور پر بروئے کار آئیں اور نشوونما پائیں۔ اس طرح انسان اپنے اس اصل مقام کو حاصل کر لے جس کے لئے اللہ نے اسے بالقوہ (Potentially) تخلیق فرمایا ہے۔ لیکن کچھ چیزیں اس کی اس نشوونما میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ "ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں" کے مصداق ان تمام چیزوں کو جمع کریں گے تو وہ ہے دنیا کی محبت۔ چنانچہ آپ قرآن مجید میں بار بار دیکھیں گے کہ جہاں انسان کی گمراہی اور بے راہ روی کے اصل سبب کی تشخیص ہوتی ہے وہاں عموماً یہ بات آئے گی :

﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا○ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى○﴾ (الاعلیٰ : ۱۶'۱۷) "تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو' حالانکہ آخرت بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی"۔ کہیں فرمایا جاتا ہے : ﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ○ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ○﴾ ہم سورۃ القیامہ کے درس میں ان آیات کا مطالعہ کر چکے ہیں کہ تمہاری گمراہی کا اصل سبب یہ ہے کہ تمہارے دل حُبّ عاجلہ میں گرفتار ہو گئے ہیں اور تم آخرت کو نظرانداز کرتے ہو ـــــ اور عاجلہ سے مراد یہ دنیا ہے۔

اب ذرا ایک قدم اور آگے آیئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس حب دنیا کا سب سے بڑا نشان' اس کی سب سے بڑی علامت (Symbol) حب مال ہے۔ سورۃ الفجر میں فرمایا : ﴿وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا○﴾ "تم مال سے بڑی محبت کرتے ہو اور تم پر اسے جمع کرنے کی دُھن سوار رہتی ہے"۔ اور سورۃ الھمزۃ میں فرمایا : ﴿اَلَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ○ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗ اَخْلَدَهٗ○﴾ "(تباہی ہے اس شخص کے لئے) جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے دوام بخشے گا"۔ پس یہ مال کی محبت ہی انسان کے اخلاقی ارتقاء اور اس کی اعلیٰ اقدار کی نشوونما میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جس رُخ پر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انسان کی شخصیت ترقی اور نشوونما پائے' اس کا ارتقاء ہو' اس کی تعمیر ہو' اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی مال کی محبت ہے ـــــ لہٰذا اس مال کی محبت کو دِل سے کھرچنے کے لئے نسخہ انفاق مال ہے۔ یعنی مال کا اللہ کی خوشنودی اور رضا کے حصول کے لئے خرچ کرنا ـــــ وہ خیرات وصدقات کی صورت میں محتاجوں' مسکینوں' یتیموں' بیواؤں کی مدد میں صرف ہو رہا ہو۔ وہ قرابت داروں کا حق ادا کرنے میں صرف ہو رہا ہو۔ وہ اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت میں صرف ہو رہا ہو۔ وہ پیغامِ الٰہی کی نشرواشاعت کے لئے صرف ہو رہا ہو۔ وہ دین کی سربلندی اور غلبہ کے لئے اور اس کے جو تقاضے ہیں ان کو پورا کرنے کے لئے صرف ہو رہا ہو۔ یہ ہے اصل میں "عمل تزکیہ" ـــــ یہ کرتے رہو گے تو دل سے مال کی محبت ختم ہو گی' جو اصلاً علامت ہے حب دنیا کی۔ اور حب دنیا کا یہ بریک (Brake) اگر کھل گیا' اس کی گرفت ختم ہو گئی تو اب تمہاری گاڑی پوری رفتار کے ساتھ اس شاہرہ پر چلے گی کہ جس پر چل کر

تم تعمیر ذات، تعمیر خودی، تعمیر شخصیت اور تعمیر سیرت و کردار کے باب میں ترقی کر سکو گے۔

اب اس ارتقاء و ترقی کے لئے قرآن مجید نے ایک دوگونہ پروگرام بتایا ہے ـــــ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ صلوٰۃ میں وہ نماز بھی شامل ہے جو فرض ہے، جس کو آپ نے ہر حالت میں ادا کرنا ہے، جس کے لئے روزانہ پانچ فرض نمازوں کا نظام موجود ہے، اور اس کے ساتھ ہی نفل نمازیں بھی صلوٰۃ کے زمرے میں شامل ہیں ـــــ اسی طرح اس زکوٰۃ کے عمل کے بھی دو اجزاء کر دیئے گئے۔ ایک "زکوٰۃ" تو لازم اور فرض ہو گئی اور اس کے لئے ایک خاص حد معین کر دی گئی ہے جسے "نصاب" کہا جاتا ہے۔ یعنی مالی حیثیت سے اس سے زائد جو بھی ہے اس پر شرح نصاب کے مطابق لازماً رقم لے لی جائے گی۔ اس کی ادائیگی فرض ہے۔ اس کو اصطلاحاً زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔

لیکن عمل تزکیہ تو دائم ہے۔ اس میں صرف زکوٰۃ مفروضہ ہی نہیں، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر مزید انفاق مال کی ترغیب ہے۔ جیسے ہم آیہ البر میں پڑھ چکے ہیں : ﴿وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ، وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ﴾ ـــــ یہاں فرض زکوٰۃ کا علیحدہ سے ذکر ہے اور اس سے پہلے ذکر کیا گیا کہ "اس نے مال محبوب ہونے کے باوجود اسے قرابت داروں، یتیموں، مساکین، مسافروں، سوال کرنے والوں اور گردنوں کے چھڑانے میں خرچ کیا" ـــــ لہٰذا مطلوب یہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ اور دو، بڑھ چڑھ کر دو ـــــ اس کی جب آخری حد پوچھی گئی کہ حضورؐ کہاں تک دیں؟ تو قرآن مجید میں اس کی وضاحت فرمائی گئی : ﴿یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ﴾ "یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں! تو (اے نبی!) ان سے کہئے جو بھی تمہاری ضرورت سے زائد ہے اسے دے ڈالو"۔ پھر مزید تشویق و ترغیب کے لئے فرمایا : ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ "تم نیکی (کے بلند ترین مقام) تک نہیں پہنچ سکو گے جب تک کہ اللہ کی راہ میں وہ چیز صرف نہ کرو جو تمہیں محبوب ہے" ـــــ اب یہ ہے وہ عمل تزکیہ جس کی ترغیب و تاکید قرآن مجید میں بار بار آتی ہے۔ آخری پارے کی سورۃ الشمس میں نفس انسانی کے بارے میں فرمایا گیا : ﴿

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ○ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ○ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ○ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ○ ﴾ "گواہ ہے یہ نفس انسانی اور جو اللہ نے اسے بنایا اور سنوارا (اور اس میں طرح طرح کی صلاحیتیں اور بہت سی استعدادات ودیعت فرمائیں۔) پھر اس میں نیکی اور بدی کا شعور بھی الہامی طور پر پیدا فرمادیا۔ تو جس کسی نے اس کا تزکیہ کرلیا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے خاک آلود کردیا وہ ناکام ونامراد ہوا" ـــــ یہی بات ہم سورۃ الاعلیٰ میں دیکھتے ہیں : ﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ○ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ○ ﴾ "کامیاب ہوگیا وہ شخص جس نے تزکیہ حاصل کرلیا اور اس نے اپنے رب کے نام کا ذکر کیا اور نماز ادا کی" ـــــ سورۃ الاعلیٰ کی یہ دو آیتیں سورۃ المومنون کی ان آیات سے بہت مشابہ ہیں : ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ○ ﴾

تو یہ تھے تعمیر سیرت کے قرآنی پروگرام کے دوسرے اور تیسرے اجزاء ـــــ یعنی ایک "اِعْرَاض عَنِ اللَّغو" جس کا براہ راست تعلق ایمان بالآخرہ اور ایمان بالقیامہ سے ہے' اور دوسرے تزکیہ پر مسلسل عمل پیرا رہنا۔ اسی کے لئے سورۃ المعارج میں یہ الفاظ آئے : ﴿ وَالَّذِيْنَ فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ○ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○ ﴾ "وہ لوگ کہ جن کے اموال میں حق ہے' جو جانا پہچانا ہے' سائل کے لئے بھی اور محروم کے لئے بھی"۔

جنسی جذبہ پر قابو رکھنا

اب ہم سورۃ المومنون کی آیات ۵ تا ۷ پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ یہ تینوں آیات بعینہٖ انہی الفاظ میں سورۃ المعارج (آیات ۲۹ تا ۳۱) میں بھی وارد ہوئی ہیں :

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ○ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ○ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ○ ﴾

"اور وہ لوگ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ سوائے اپنی بیویوں اور باندیوں کے' پس ان کے معاملہ میں ان پر کوئی ملامت نہیں۔ پھر جو کوئی اس سے تجاوز کرے گا تو وہی ہیں حد سے بڑھنے والے"۔

تعمیر سیرت کے جس قرآنی پروگرام کا ہم سورۃ المومنون کی ابتدائی گیارہ آیات اور سورۃ المعارج کی آیات ۱۹ تا ۳۵ کے حوالہ سے مطالعہ کر رہے ہیں اس میں چوتھا وصف یا اس کا چوتھا جزو جنسی جذبہ پر قابو رکھنا ہے ـــــ یہ بات اپنی جگہ اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ انسان میں مختلف قسم کے حیوانی میلانات اور داعیات ہیں ان میں سے ایک اہم میلان جنسی جذبہ بھی ہے۔ انسان کا پیٹ کھانے کو مانگتا ہے اس سے اس کی زندگی کا تسلسل وابستہ ہے۔ اسی طرح تمام حیوانات میں اپنے نسلی تسلسل کو برقرار رکھنے کے لئے فاطر فطرت نے جنسی جذبہ ودیعت کیا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دورِ جدید کے ایک بہت بڑے ماہر نفسیات فرائڈ نے جنسی جذبہ کو انسان کے محرکات عمل میں سب سے زیادہ قوی جذبہ قرار دیا ہے۔ ہم اگرچہ اس کو تسلیم نہیں کرتے' ہمارے نزدیک یہ اس کا مغالطہ ہے' اس کی نگاہ میں ایک چیز بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ اور انسانی فکر کا یہ خاصّہ ہے کہ بسا اوقات کوئی ایک چیز انسان کے ذہن پر اس طرح مسلط ہو جاتی ہے کہ باقی تمام چیزیں اسے اس کے تابع نظر آنے لگتی ہیں یہی معاملہ فرائڈ کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اپنی جگہ پر جنسی داعیہ ایک بہت بڑا محرک اور نہایت قوی جذبہ ہے۔

اس ضمن میں اگر ہم تاریخ انسانی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں انسانوں میں افراط و تفریط کی دو انتہائیں نظر آتی ہیں ـــــ ایک طرف انسان نے اس جذبہ کو فی نفسہٖ شر قرار دیا کہ یہ ہے ہی سرتاسر برائی' یہ برائیوں کی ماں ہے۔ اسی لئے ہمیں ایک بہت بڑے طبقہ میں یہ خیال ملے گا کہ جنسی جذبہ فی نفسہٖ شر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی مذاہب میں روحانی ترقی کا راستہ تجرد کی زندگی کے ذریعہ سے اختیار کیا گیا کہ ساری عمر شادی بیاہ نہ کیا جائے' گھر گرہستی کا کھکیڑ نہ پالا جائے' اس لئے کہ یہ راستہ ہے ہی برائی کا' اس میں کوئی خیر ہے ہی نہیں۔ یہ رہبانیت کا نظریہ ہے جو دنیا میں مختلف علاقوں میں مختلف ناموں سے رائج رہا ہے۔

اس ضمن میں دوسری انتہا یہ ہوئی کہ اپنے اس جنسی جذبہ کی آزاد اور بے قید طریق سے تسکین کرنا' اس میں حلال و حرام کی کوئی تمیز نہ کرنا اور صحیح و غلط کے فرق ۔

امتیاز کو ملحوظ نہ رکھنا' جیسے خیالات کو روا رکھا گیا بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر نوع انسانی جن بہت بڑی بڑی گمراہیوں میں مبتلا ہوئی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ جذبہ Pervert ہو کر' یعنی کج رو ہو کر فطرت کی جو ایک معین راہ ہے اس کی بجائے دوسرے راستے اختیار کرتا ہے تو تاریخ انسانی میں یہ دو انتہائیں ہمیشہ موجود رہی ہیں۔

ان آیات میں قرآن مجید کا جو متوازن بیان ہمارے سامنے آتا ہے اس کے متعلق یہ بات اہم ہے کہ تین تین آیات دونوں مقامات پر (سورۃ المومنون اور سورۃ المعارج میں) اس شان سے وارد ہوئی ہیں کہ ایک شوشے تک کا فرق نہیں ہے' اور جیسا کہ ہم آخر میں دیکھیں گے کہ یہاں سات اوصاف زیر بحث آئے ہیں جن میں سے تین پہلے ہیں' تین بعد میں ہیں' مرکزی بحث یہی ہے۔ پھر اس مسئلہ پر دونوں مقامات پر تین تین آیات وقف کی گئی ہیں۔ تو اس سے اس مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے نزدیک

ان آیات میں ہمارے سامنے جو متوازن بات آتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر قانون شریعت کے دائرہ میں رہ کر حلال پر اکتفا کرتے ہوئے ایک انسان اپنے فطری جذبہ کی تسکین حاصل کرتا ہے تو فرمایا گیا: ﴿فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ﴾ اس میں کوئی ملامت کی بات نہیں ہے اس میں فی نفسہٖ کوئی برائی نہیں ہے۔ بلکہ حضور ﷺ نے تو صاف طور پر فرمایا: ((لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ)) "اسلام میں رہبانیت بالکل نہیں ہے"۔ اس کے ساتھ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ)) نکاح کرنا' شادی بیاہ کرنا' گھر گرہستی کی زندگی اختیار کرنا میرا طریقہ ہے' یہ میری سنتوں میں سے ایک سنت ہے ـــــ لہٰذا تعمیر سیرت اور اخلاقی ترفع حاصل کرنے کے لئے ترک دنیا والی روش اسلام کی روش نہیں ہے وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت نہیں ہے۔ وہ حضورؐ کا طریقہ نہیں ہے۔

لیکن دوسری طرف اس کے لئے حد بندیاں کر دی گئیں۔ دوسرے ناجائز راستے بند کر کے نکاح کا جائز راستہ کھول دیا گیا کہ اس راستہ سے انسان اپنے جذبہ کی تسکین حاصل کرے۔ اس کے لئے حدیث میں یہاں تک کہا گیا کہ ایک بندۂ مومن کے لئے یہ عمل بھی عبادت کا ایک جزو بن جاتا ہے' جب کہ یہ فعل اس قاعدہ' اس ضابطہ اور قانون کے تابع رہ کر ہو رہا ہو جو اللہ نے اس کے لئے معین فرما دیا ہے۔

اسلام میں ملکِ یمین کی حیثیت

ان آیات میں ضمنی طور پر ایک مسئلہ ایسا بھی سامنے آیا ہے جس کے بارے میں بہت سے سوالات ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے جو قانونی راہ ہے اس کو بیان کرتے ہوئے قرآن مجید دونوں مقامات پر ﴿اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِھِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ﴾ کے الفاظ استعمال کر رہا ہے۔ یعنی بیویوں کا ذکر بھی ہے اور باندیوں یا لونڈیوں کا بھی۔ یہ معاملہ بہت پیچیدہ بھی ہے اور بڑا تفصیل طلب بھی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس ضمن میں چند باتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لی جائیں تو ان شاء اللہ تمام اشکالات رفع ہو جائیں گے۔

پہلی بات یہ ہے کہ لونڈیوں یا غلاموں کا ادارہ (Institution) اسلام کے اپنے نظام کا کوئی جزو لازم نہیں ہے۔ لونڈی یا غلام رکھنا فرائض میں سے ہے نہ واجبات میں سے۔

دوسری بات یہ کہ جس وقت قرآن مجید نازل ہوا اور محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ مبارکہ ہوئی تو معاشرہ میں یہ ادارہ بالفعل موجود تھا' اور جیسے بہت سی دوسری چیزیں ایسی تھیں جو اصلاح طلب تھیں ویسے ہی یہ ادارہ بھی اصلاح طلب ادارہ کی حیثیت سے موجود تھا۔ جس طرح اسلام نے دوسری چیزوں میں اپنے اصلاحی پروگرام کو تدریجی طور پر آگے بڑھایا' ایسے ہی اس معاملہ میں بھی اسلام نے بہت سی اصلاحات نافذ کیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا اجراء فرمایا۔ سب سے پہلی اصلاح یہ ہوئی کہ یہ بات بار بار فرمائی گئی کہ یہ لونڈی غلام تمہارے ہی بھائی بند ہیں۔ یہ صرف ایک relationship ہے جو دنیا میں تمہارے اور ان کے مابین قائم ہو گئی ہے' جیسے ایک آجر (employer) ہے اور ایک مستاجر (employee) ہے لیکن بحیثیت انسان دونوں برابر ہیں۔ پس اگر یہ اونچ نیچ کہیں چلی آ رہی ہے کہ کوئی آقا ہے اور کوئی غلام ہے تو بحیثیت انسان وہ مساوی ہیں۔ لہٰذا آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ جو کچھ تم خود کھاتے ہو اپنے غلاموں کو وہی کچھ کھلاؤ' اور جو کچھ تم خود پہنتے ہو وہی ان کو پہناؤ۔ ان کے ساتھ محبت'

شفقت اور حسن سلوک رکھو۔ ایک طرف تو یہ اخلاقی تعلیم جس کے ذریعہ سے ان کی تالیف قلبی کی گئی۔ یعنی وہ انسان جو گرے ہوئے تھے' دبے ہوئے تھے' پسے ہوئے تھے' نبی اکرم ﷺ نے ان کو اس حالت سے اٹھا کر آزاد انسانوں کے برابر لانے کی کوشش فرمائی۔ اس کی دشمن بھی گواہی دیتے ہیں۔ ایچ جی ویلز' جو حضور ﷺ سے بہت دشمنی رکھتا ہے' وہ بھی گواہی دیتا ہے کہ محمد (ﷺ) نے یہ پروگرام واقعتاً و بعمل لاکے دکھایا۔

تیسری بات یہ کہ اسلام نے ان کی آزادی کا ایک راستہ کھول دیا۔ چنانچہ قرآن مجید میں مکاتبت کا حکم آیا۔ یعنی اگر کوئی غلام اپنے آقا سے یہ معاہدہ کرلے کہ میں اتنی رقم (اپنی آزادی کی قیمت کے طور پر) تمہیں ادا کردوں گا تو اس آقا کو ازروئے شریعت پابند کیا گیا ہے کہ وہ اس غلام کے ساتھ معاہدہ کرے۔ اب وہ غلام محنت کرکے کمائی کرے اور طے شدہ رقم اپنے آقا کو دے دے تو وہ آزاد ہو جائے گا۔ اس معاملہ میں کوئی آقا انکار نہیں کرسکتا کہ میں تمہارے ساتھ یہ معاہدہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ ان کی آزادی کے لئے پہلی شکل یہ اختیار کی گئی۔ چنانچہ فرمایا گیا : ﴿ وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ..... ﴾ (النور : ۳۳) "اور تمہارے مملوکوں میں سے جو مکاتبت کی درخواست کریں ان سے مکاتبت کرلو....."۔ ﴿ فَكَاتِبُوْهُمْ ﴾ فعل امر ہے اور امر وجوب کے لئے بھی آتا ہے۔ پھر تمام مسلمانوں حتیٰ کہ ان کے آقاؤں کو بھی تلقین کی گئی کہ تم اس معاملہ میں ان کے ساتھ تعاون کرو اور صدقہ و خیرات سے ان کی مدد کرو۔ چنانچہ اسی آیت میں جس میں مکاتبت کے لئے حکم آیا ہے آگے چل کر فرمایا : ﴿ وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ﴾ "اور دو ان کو اللہ کے مال میں سے جو اس نے تم کو دیا ہے۔" یہاں یہ نکتہ بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ انسان کے پاس جو مال ہے اس کی ملکیتِ حقیقی کی نسبت اللہ تعالیٰ اپنی طرف فرما رہا ہے۔ یہ دوسری شکل ہے جو قرآن مجید نے اختیار کی۔ اس طرح ان کی تالیف قلبی' ان کے رتبہ کی بلندی اور ان کی آزادی کی راہ نکلی۔

پھر آپ کو یاد ہو گا کہ مطالعہ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب کے دوسرے سبق میں ہم نے حقیقی نیکی کو سمجھنے کے لئے سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۱۷۷ کا مطالعہ کیا تھا' جسے میں "آیت البر" سے تعبیر کیا کرتا ہوں۔ وہاں گردن چھڑانے یعنی غلاموں کی آزادی کے عمل

کو اعلیٰ ترین نیکی کے کاموں میں شمار کیا گیا ہے۔ پھر سورۃ التوبہ کی آیت نمبر ۶۰ میں صدقات واجبہ یعنی زکوٰۃ کے مستحقین کی جو آٹھ مدات مقرر فرمائی گئی ہیں' ان میں بھی گردن چھڑانے یعنی غلاموں کی آزادی کے لئے زکوٰۃ سے رقم ادا کرنے کی مد بھی شامل ہے۔ مزید یہ کہ سورۃ البلد میں بڑے پیارے انداز میں غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ فرمایا : ﴿ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ○ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ ○ فَكُّ رَقَبَةٍ ○ ﴾ "انسان گھاٹی کو عبور کر نہیں پاتا اور تم جانتے ہو کہ وہ گھاٹی کون سی ہے!" اس گھاٹی کی جب تفصیل بیان کی گئی تو سب سے پہلے ذکر ہوا : "فَكُّ رَقَبَةٍ" یعنی "کسی گردن کو آزاد کرا دینا" ـــــ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دفترِ فضائل کا ایک درخشاں باب یہ بھی ہے کہ آپؓ نے غلاموں اور کنیزوں کے طبقے میں سے اسلام قبول کرنے والے چھ مسلمانوں کو' جن میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں' ایک خطیر رقم دے کر خریدا اور ان کو آزاد کیا ـــــ حضرت عثمان ذُوالنورین رضی اللہ عنہ خود فرماتے ہیں کہ میں جس روز سے ایمان لایا ہوں (اور اندازہ کیجئے کہ آپؓ سابقون الاولون میں سے ہیں' ایمان لانے والوں میں آپؓ کا چھٹا نمبر ہے) اُس روز کے بعد سے کوئی جمعہ مجھ پر ایسا نہیں گزرا کہ میں نے ایک غلام آزاد نہ کیا ہو' اور اگر اتفاقاً کسی جمعہ کو میرے لئے یہ ممکن نہ ہوا تو اگلے جمعہ کو میں نے دو غلام آزاد کئے یا کرائے ـــــ پھر شریعت کے احکام کی بعض فروگذاشتوں کے کفارہ کے طور پر ایک غلام یا لونڈی کو آزاد کرنا یا کرانا قرار دیا گیا ـــــ تو یہ ہیں وہ تدابیر جو اسلام نے اس مسئلہ کی اصلاح کے لئے اختیار کیں۔

اس تیسری بات کے ضمن میں یہ بات بہت اہم ہے کہ اسلام نے اس بات کو سب سے بڑے گناہوں یعنی کبائر میں سے قرار دیا ہے کہ کسی آزاد انسان کو پکڑ کر غلام بنا لیا جائے ـــــ اسلام میں صرف ان لوگوں کو غلام اور لونڈی بنایا گیا ہے جو خالص قتال فی سبیل اللہ کے نتیجہ میں محاذِ جنگ پر گرفتار ہوتے تھے۔ ان کو کبھی فدیہ لے کر' کبھی بطورِ احسان اور کبھی مسلمان قیدیوں کے تبادلہ میں رہا کر دیا جاتا تھا۔ اگر ان میں سے کوئی صورت مصالح دینی کے لحاظ سے مناسب نہ ہو تو ان کو مسلمان معاشرہ میں تقسیم کر دیا جاتا تھا اور اسلام نے ان کے لئے حسن سلوک کی اعلیٰ اخلاقی تعلیمات دی ہیں۔

اِس وقت دنیا میں جو سب سے زیادہ متمدن اور مہذب ترین مملکت کہلاتی ہے' یعنی امریکہ' اس میں جو کالے ہیں وہ بھلا کون ہیں؟ انہیں افریقہ سے اس طرح پکڑ کر جس طرح شکاری گھات لگا کر شکار کو زندہ پکڑتے ہیں' جہازوں میں بھیڑ بکریوں کی طرح لاد کر بطور غلام امریکہ لے جایا گیا۔ وہاں ان کی خرید و فروخت ہوتی تھی' حالانکہ وہ اپنے ملک کے آزاد باشندے تھے۔ اگرچہ یہ ماننا پڑے گا کہ بعد میں امریکی سوسائٹی نے کسی حد تک اپنے آباء واجداد کے اس جرم کی تلافی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں ابراہیم لنکن کی عظمت تسلیم کی جانی چاہئے۔ لیکن امریکن ذہناً اب بھی کالوں کو اپنے برابر سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ تاریخ میں یہ کچھ بھی ہوا اُن لوگوں نے کیا ہے جو صدیوں سے بڑے متمدن اور مہذب ہونے کے مدعی چلے آ رہے ہیں' جبکہ اسلام نے اس کو ایک بہت بڑا گناہ قرار دیا ہے کہ آپ کسی آزاد کو پکڑ کر غلام بنا لیں۔

اب میں چوتھی بات یہ عرض کروں گا کہ اپنی جگہ یہ حقیقت ہے کہ غلامی کی قطعی و حتمی منسوخی (Final Abolition) کی کوئی آیت قرآن مجید میں موجود نہیں ہے۔ جیسے کہ ہم شراب کے بارے میں دیکھتے ہیں کہ ابتدا میں حکم آیا کہ نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔ تدریجاً اصلاح کا قدم اٹھایا گیا' اور بالآخر وہ وقت آ گیا کہ فرمایا گیا : ﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ﴾ "پس کیا تم (اس سے) باز آتے ہو کہ نہیں؟" ـــــ اور ﴿فَاجْتَنِبُوْهُ﴾ "اب اس سے باز آ جاؤ" ـــــ اسی طرح سود کی سب سے پہلے سورۃ الروم میں اخلاقی سطح پر مذمت کی گئی۔ پھر سورۂ آل عمران میں سود در سود سے منع کیا گیا۔ پھر حرمت کی آخری آیت ۹ھ میں حضور ﷺ کے انتقال سے کچھ عرصہ قبل نازل ہو گئی' جو سورۃ البقرۃ میں ہے اور جس میں ہر نوع کا سود حرام مطلق قرار دے دیا گیا۔ لیکن غلاموں اور لونڈیوں کے بارے میں اس نوعیت کا کوئی حکم قرآن مجید میں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں یہ ادارہ کچھ عرصہ تک چلتا رہا ہے۔

اب آپ یہ ہدایات پیش نظر رکھئے کہ جو خود کھاؤ وہی انہیں کھلاؤ' جو خود پہنو وہ ان کو پہناؤ اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ پھر یہ کہ ان کی گردنوں کو چھڑانے کے لئے

اخلاقی تعلیمات بھی موجود ہوں' جیسے ﴿فَكُّ رَقَبَةٍ﴾ اور صدقات واجبہ اور صدقات نافلہ میں گردنیں چھڑانے کی مستقل مد رکھ دی گئی ہو۔ تو ان اسلامی تدابیر کا نتیجہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عالم اسلام میں وہ دَور بھی آیا کہ مشرق و مغرب میں عظیم ترین مملکتیں ان کی تھیں جن کو ممالیک اور غلام کہتے ہیں۔ ہندوستان میں جو خاندان غلاماں حکمران تھا اور مصر میں جو ممالیک کی حکومت تھی تو یہ اُس اصلاحی عمل (Reform) کا نتیجہ ہے جس کا آغاز حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ غلاموں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ غلامی سے اٹھا کر شہنشاہی تک پہنچا دیا۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ غلام تختِ ہند پر متمکن ہے۔ وہ چاہے قطب الدین ایبک ہو یا شمس الدین التمش جیسا درویش صفت اور ولی اللہ بادشاہ ہو۔ اسی طرح آپ کو دَورِ خلفائے راشدینؓ' دَورِ بنو اُمیّہ اور دَورِ بنو عباس میں علوم دین کی مسندوں پر بہت سے ایسے اکابر جلوہ افروز نظر آئیں گے جو آزاد کردہ غلاموں کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے' اور جن کی جوتیاں سیدھی کرنا اور اٹھانا بنو امیہ اور بنو عباس کے باجبروت بادشاہوں کے شہزادگان اپنے لئے بہت بڑی سعادت خیال کرتے تھے۔

لیکن بہرحال اگر حکمتِ خداوندی نے اس کی آخری تنسیخ نہیں کی ـــــ اور کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ قرآن مجید میں کوئی آیت ایسی ہے جو اِس ادارہ کو حتمی و قطعی طور پر منسوخ قرار دیتی ہو ـــــ تو ہمیں بحیثیت مسلمان اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ پر ایمان و اعتماد رکھنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ بھولنے والا نہیں ہے کہ کہیں معاذ اللہ ثم معاذ اللہ نسیان سے یہ بات رہ گئی ہو۔ ﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا﴾ یہ معاذ اللہ کسی بھول چوک سے نہیں ہوا۔ ہمیں بہرحال اپنے علم سے اللہ کے علم کو مقدم رکھنا ہے۔ کہاں ہماری عقل اور کہاں ہماری منطق! کہاں ہمارے فلسفے! جو انتہائی کوتاہ اور محدود ہیں اور کہاں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں!! تو وہ جو اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور حکمت کاملہ ہے یقیناً یہ اسی کا ظہور ہے کہ قرآن مجید میں اس کی آخری درجہ میں تنسیخ نہیں آئی ـــــ!!!

تعمیرِ سیرت کے لئے آخری تین اوصاف

زیر نظر درس میں انسان کی انفرادی سیرت و کردار کی تعمیر کے لئے اللہ تعالیٰ نے

سات نکات پر مشتمل جو لائحہ عمل عطا کیا ہے' اب ہم اس کے آخری تین اوصاف کا مطالعہ کریں گے۔ اس لائحہ عمل کا اولین اور اہم ترین نکتہ اِقامۃ الصلٰوۃ ہے' دوسرا فعل الزکٰوۃ' تیسرا اِعراض عنِ اللغو' اور چوتھا ضبط نفس یعنی جنسی جذبے پر قابو یافتہ ہونا۔ اس لائحہ عمل کے آخری تین اوصاف یہ ہیں۔ (۱) امانت کی پاسداری (۲) ایفائے عہد (۳) اپنی شہادتوں پر قائم رہنا۔

اب اگر آپ ایک خاص اعتبار سے غور کریں گے تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ پہلے تین اوصاف کا تعلق ایک شخص کی اپنی ذات کے ساتھ ہے' کوئی دوسرا شخص ان سے متعلق نہیں ہوتا۔ نماز کو قائم رکھنا' بے کار اور بے مقصد باتوں سے اعراض' اللہ کی راہ میں خرچ کرنا' یہ تو خالص ذاتی نوعیت کے اوصاف ہیں۔ چوتھا وصف وہ تھا کہ جس پر انسانی تمدن کی صحت کا دارومدار ہے۔ اس لئے کہ انسانی تہذیب و تمدن میں خاندان کے ادارے کو جڑ اور بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ عائلی زندگی اور خاندان کے ادارے کی صحت اور استحکام کا دارومدار اس پر ہے کہ انسان اپنے جنسی جذبہ پر قابو اور ضبط رکھتا ہو' اسے کسی غلط رُخ پر نہ پڑنے دے۔

اب جو آخری تین اوصاف ہیں جن پر ہمیں اجمالاً گفتگو کرنی ہے' ان کا تعلق انسان کی اجتماعی زندگی کی اس سطح سے ہے جسے ہم ملی اور سیاسی زندگی کہتے ہیں۔ یعنی حکومت کا نظام' نظام مملکت' قومی و ملی معاملات۔ اس ضمن میں آپ دیکھیں گے کہ تین اوصاف نہایت ضروری ہیں۔ ان میں سب سے پہلا وصف امانتداری اور دوسرا ایفائے عہد ہے۔

امانت داری اور پاسِ عہد کا ذکر سورۃ المعارج میں بھی ہے اور سورۃ المومنون میں بھی۔ اور دونوں جگہ پر ایک شوشے کے فرق کے بغیر بعینہٖ یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں :

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ۝ ﴾ امانت داری اور ایفائے عہد کے مابین جو ربط و تعلق ہے اور ان کی جو اہمیت ہے وہ ہمیں نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ سے بخوبی معلوم ہو جاتی ہے۔ اس حدیث کے راوی حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جو مسلسل دس برس تک حضور ﷺ کے خادم خاص رہے ہیں' اور اس کو روایت کیا

ہے امام بیہقی رحمہ اللہ نے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ : قَلَّمَا خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلَّا قَالَ "شاذ ہی کبھی ایسا ہوا ہو گا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی خطبہ ارشاد فرمایا ہو اور اس میں آپؐ نے یہ الفاظ نہ فرمائے ہوں" ((لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَۃَ لَہٗ وَلَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَھْدَ لَہٗ)) "جس میں امانت داری کا وصف نہیں ہے اس کا کوئی ایمان نہیں ہے' اور جس میں ایفائے عہد کا وصف نہیں ہے اس کا کوئی دین نہیں ہے" ـــــ اس لئے کہ ایمان کا امانت داری سے گہرا رشتہ ہے۔ دونوں کا مادہ ہی ایک لفظ ہے۔ "امن" سے ہی لفظ امانت بنا اور اسی سے ایمان بنا۔ چنانچہ یہ لازم و ملزوم ہیں' ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایمان ہے تو امانت کا وصف بھی ہو گا' اگر امانت کا وصف نہیں ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فتویٰ مبارک کی زد سے حقیقی و قلبی ایمان بھی نہیں ہے ـــــ اسی طرح دین تو اصل میں نام ہے بندے اور رب کے مابین ایک عہد و معاہدہ کا۔ ہم نماز کی ہر رکعت میں جب سورۃ الفاتحہ کی یہ مرکزی آیت پڑھتے ہیں : ﴿ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۝ ﴾ "اے رب ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہیں گے" تو یہ اللہ کے ساتھ ایک قول و قرار' ایک معاہدہ اور ایک میثاق ہے۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ جو شخص انسانوں کے ساتھ کئے گئے عہد نہیں نباہ سکتا' جو انسانوں کے ساتھ کئے ہوئے وعدے پورے نہیں کر سکتا' ظاہر بات ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ پوری زندگی کے لئے کیا ہوا اتنا بڑا معاہدہ کیسے نباہے گا۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ((لَا دِیْنَ لِمَنْ لَّا عَھْدَ لَہٗ)) ایسا شخص حقیقی دین سے تہی دست ہے۔

ایفائے عہد کے ضمن میں ہمارے اس منتخب نصاب کے دوسرے درس میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ وہاں الفاظ مبارکہ آئے تھے ﴿ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عٰھَدُوْا ﴾ "اور اپنے عہد کو پورا کرنے والے جب کہ باہم کوئی معاہدہ کر لیں"۔ اور وہاں تفصیل سے عرض کیا گیا تھا کہ ہمارے جتنے بھی بین الانسانی معاملات ہوتے ہیں ان سب میں کوئی نہ کوئی معاہدہ کار فرما ہوتا ہے۔ جیسے آجر اور مستاجر کا تعلق کسی نہ کسی معاہدہ پر قائم ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص کہیں عارضی یا مستقل ملازمت کر رہا ہے تو ملازم رکھنے والے اور ملازمت کرنے والے کے مابین کوئی قول و قرار ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ شادی بھی ایک

معاشرتی معاہدہ ہے۔

امانت داری اور ایفائے عہد کا ذکر سورۃ المومنون اور سورۃ المعارج دونوں میں آیا ہے۔ لیکن سورۃ المعارج میں ایک تیسری چیز کا اضافہ کیا گیا ہے : ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَائِمُوْنَ ۝ ﴾ "وہ لوگ جو اپنی شہادتوں پر قائم رہتے ہیں"۔ غور طلب بات ہے کہ اس کا ذکر سورۃ المومنون میں کیوں نہیں آیا! یہ وہ واحد مثال ہے کہ جب ہم نے دونوں مقامات کا تقابلی مطالعہ کیا تو اس کا ذکر ہمیں سورۃ المومنون کی ابتدائی گیارہ آیات میں نہیں ملا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت شہادت بھی ایک امانت ہے۔ اگر کسی وقوعہ کے وقت آپ موجود تھے' آپ کی موجودگی میں کسی نے کسی پر دست درازی کی ہے' کسی نے کسی پر کوئی ظلم کیا ہے' کسی نے کسی کو قتل کیا ہے' کوئی دوسرا حادثہ ہوا ہے' تو آپ کی وہاں موجودگی کی بنا پر جو شہادت آپ کے پاس ہے وہ معاشرہ' قوم و ملت اور ملک کی ایک امانت ہے۔ اگر آپ اسے چھپاتے ہیں تو آپ اس امانت میں خیانت کر رہے ہیں۔ لہٰذا جو چیز کسی فعل میں آپ سے آپ مضمر ہوتی ہے قرآن حکیم کہیں اس کا ذکر نہیں کرتا اور کہیں اس مضمر شے کو بھی عیاں کر دیتا ہے۔ چنانچہ شہادت بھی درحقیقت ایک امانت ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے امانت کے تصور کو اتنی وسعت دی ہے کہ آپؐ نے فرمایا : ((اِنَّ الْمَجَالِسَ بِالْاَمَانَاتِ)) "مجالس بھی امانتوں پر قائم ہیں"۔ کسی محفل میں کوئی بات ہو رہی تھی' آپ بھی اس میں موجود تھے' آپ نے وہاں کوئی بات سنی اور کہیں اور جا کر بیان کر دی جب کہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی تو یہ خیانت ہے۔ آپ نے کسی محفل کی بات کو اگر کہیں اور جا کر نقل کر دیا تو غیر شعوری یا شعوری طور پر بات میں کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے اور بات کرنے والے کے منشاء کے خلاف بھی بیان ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ بات کہنے والے کے صحیح مفہوم کو سمجھ نہ پائے ہوں۔ تو نہ معلوم اس سے کتنے فتنے اٹھنے کا احتمال پیدا ہو سکتا ہے۔ اور عین ممکن ہے یہی بے احتیاطی بعض لوگوں کو بعض کے خلاف بدظنی اور بدگمانی میں مبتلا کرنے کا سبب بن جائے اور دلوں میں کدورت اور رنجش ڈیرے ڈال لے۔ تو کسی مجلس اور کسی محفل میں آپ شریک ہیں تو وہاں کی

باتیں آپ کے پاس ایک امانت کے طور پر ہیں جن کی آپ کو حفاظت کرنی ہے ـــــ اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا : ((اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ)) جس کسی سے کوئی مشورہ طلب کیا جاتا ہے گویا اس کے پاس بھی ایک امانت رکھوائی گئی ہے۔ مشورہ طلب کرنے والے نے آپ پر اپنا اعتماد ظاہر کیا ہے۔ اب اگر آپ دیانتاً جو رائے رکھتے ہیں وہ کچھ اور ہے' لیکن آپ کسی مصلحت سے اپنی اس دیانت دارانہ رائے کو چھپا کر کوئی اور رائے ظاہر کرتے ہیں تو آپ نے اس کی امانت میں خیانت کی۔ یہ معاملہ بھی' جیسا کہ عرض کیا گیا' شہادت کا ہے۔

سورۃ البقرہ میں ایک بڑی اہم آیت ہے جس کے درمیان میں فرمایا گیا ہے : ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ...﴾ (آیت ۱۴۰) "اُس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا کہ جس کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی شہادت ہو اور وہ اسے چھپائے"۔ اِس فرمانِ الٰہی اور امانت و شہادت کے حوالہ سے ہمیں امّتِ مسلمہ کا جو فرض منصبی ہے اسے سمجھنا چاہئے۔ ہمارے پاس اللہ کا کلام ہے' اللہ کی ہدایت ہے' اللہ کا قانون ہے' اور اللہ کی شریعت ہے۔ پھر ہمارے پاس اللہ کے رسول جناب محمد ﷺ کی سنت ہے' حضورؐ کی احادیث ہیں۔ آپؐ کا اسوۂ حسنہ کامل صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہ تمام امانتیں ہیں جن کو ادا کرنے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہمارے کاندھوں پر رکھی گئی ہے' لہٰذا اِن امانتوں کو ادا کرنا پوری امت مسلمہ کا فریضہ ہے۔ اس لئے کہ یہ پوری نوع انسانی کے لئے ہیں' صرف ہمارے لئے نہیں ہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا وصف رسولِ امین یعنی امانت دار رسولؐ ہے' جن کے پاس پیغام ربانی آیا اور انہوں نے اسے بلاکم و کاست لوگوں تک پہنچا دیا۔ چنانچہ امانت کا حق ادا کر دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام اس پیغام کے پہلے امین ہیں' ان کا لقب بھی رسولِ امین ہے۔ دوسرے امین جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ ہیں۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے یہ امانت پہنچائی نبی اکرم ﷺ کو' اور حضورؐ نے یہ امانت پہنچا دی اُمت کو ـــــ اور اسی کو ہم یوں تعبیر کریں گے کہ نبی اکرم ﷺ نے امت کے سامنے حق کی گواہی دے دی' توحید کی گواہی دے دی' اپنی رسالت کی گواہی دے دی' قرآن کی حقانیت کی گواہی دے دی'

دین و شریعت کے اوامر و نواہی اور ہر ہر فعل و عمل کی گواہی دی' قولاً بھی اور عملاً بھی۔ اب اس امانت اور شہادت کو ادا کرنے کی ذمہ داری کا بوجھ امت مسلمہ کے کاندھوں پر عائد ہوتا ہے' جس کا ہر وہ شخص ایک فرد اور رُکن ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا اور کہلواتا ہے۔

ہمارا فرض منصبی یہ قرار دیا گیا ہے کہ ہم اس حق کی' اس دین کی' اس توحید کی اور جناب محمد ﷺ کی رسالت کی شہادت دیں' کہ جن کے توسط سے ہمیں یہ "الہدیٰ" اور یہ "الحق" ملا ہے۔ اس موقع پر علامہ اقبال کا یہ مصرع بے اختیار میری زبان پر آجاتا ہے کہ : ع "دے تُو بھی محمدؐ کی صداقت کی گواہی" یہ گواہی ہمیں قولاً بھی دینی ہے اور عملاً اور فعلاً بھی۔ یہ گواہی ہم نے اپنی گفتگو' دعوت و تبلیغ اور اپنی قوت بیانیہ سے دینی ہے۔ یہ گواہی ہم نے اپنے قلم سے' مدلل مضامین و مقالات کی صورت میں دینی ہے' اور یہ گواہی ہمیں اپنے کردار اور اپنی سیرت سے دینی ہے ـــــ اگر ہم یہ نہیں کرتے تو ہم کتمانِ شہادت کے بہت بڑے مجرم ثابت ہو رہے ہیں : ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ...﴾

یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ اس آیت سے چند آیات بعد سورۃ البقرہ میں امّتِ مسلمہ کا فرض منصبی بایں الفاظ مبارکہ بیان ہوا ہے : ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ یعنی ہم نے تمہیں ایک امت وسط (درمیانی امت) بنایا ہی اس لئے ہے کہ تم ہو جاؤ گواہ پوری نوعِ انسانی پر اور رسولؐ گواہ ہو جائیں تم پر۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اہم مضامین قرآن مجید میں کم از کم دو جگہ ضرور آتے ہیں۔ سورۃ المومنون کی گیارہ اور سورۃ المعارج کی سترہ آیات کے باہمی تقابل سے ہم پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی ہے اور ان مضامین کی اہمیت بھی سامنے آگئی ہے۔ اسی کی ایک مثال اور جان لیجئے۔ سورۃ المومنون سے متصلاً قبل سورۃ الحج ہے۔ سورۃ المؤمنون کی پہلی آیت ہے : ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝﴾ اور سورۃ الحج کی جو آخری آیت ہے اس میں اسی شہادت علی الناس کا ذکر ہے۔ مسلمانوں سے خطاب فرما کر کہا جا رہا ہے :

﴿وَ جَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰكُمْ﴾ یعنی اللہ کی راہ میں محنتیں کرو، مشقتیں کرو، ایثار کرو، قربانیاں دو، جان و مال کھپاؤ، مجاہدہ کرو، جیسا کہ اس کی راہ میں جہاد کا حق ہے۔ اس نے تمہیں چن لیا ہے۔ تمہیں امورِ نبوت کا وارث بنا دیا، کتاب الٰہی کا وارث بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظیم ترین امانت تمہارے سپرد کی ہے، اب اس کا حق ادا کرو ـــــ اور اسی آیت میں ایک Sub-ordinate Clause کے بعد الفاظ آئے :
﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ﴾ "تاکہ رسول (ﷺ) گواہ بن جائیں تم پر اور تم گواہ بن جاؤ پوری نوع انسانی پر" ـــــ تو یہ ہے پوری امت مسلمہ کی اجتماعی (Collective) ذمہ داری جو شہادت کے اس لفظ کے حوالہ سے ہمیں جان لینی چاہئے۔

ان آیات کے ذریعے تین اوصاف پاس امانت، پاس عہد اور شہادت کی ادائیگی کے بعد، سورۃ المومنون اور سورۃ المعارج دونوں میں اولین اور اہم ترین وصف یعنی اقامت صلوٰۃ اور اس کی حفاظت کے وصف کا اعادہ فرمایا گیا ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ۝﴾ اور ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ۝﴾ کے الفاظ میں ـــــ پھر سورۃ المومنون میں فرمایا گیا : ﴿أُولٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ۝ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۝﴾ اور سورۃ المعارج میں ارشاد ہوا : ﴿أُولٰئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ۝﴾ یہ ہیں وہ لوگ جو جنت الفردوس کے وارث بنیں گے۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کا اعزاز و اکرام ہوگا جنتوں میں ـــــ اللہ تعالیٰ ہمیں ان اوصاف کو اپنی شخصیتوں میں پیدا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں بھی جنت میں داخل ہونے والوں میں شامل کر دے۔ آمین یا ربّ العالمین!

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

سیرت وسوانح

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ

عبدالرشید عراقی

علم حدیث اور اس کے متعلقات میں جن محدثین کرام نے اپنا ایک مقام بنایا اور اُن کو اکابر محدثین اور ممتاز شارحین حدیث میں شمار کیا گیا ہے ان میں امام یحییٰ بن شرف نوویؒ سرفہرست ہیں۔ علمائے طبقات و تراجم نے امام نووی کو امام حدیث کے لقب سے یاد کیا ہے۔ حافظ ذہبیؒ لکھتے ہیں :

"امام نووی حدیث وفنون حدیث کے حافظ و متبحر عالم، رجال واسناد اور صحیح و سقیم حدیثوں کی پرکھ کے ماہر تھے"۔ {۱}

امام یافعی نے ان کو حدیث میں وسیع النظر اور کثیر المعرفت لکھا ہے {۲}۔ علمائے طبقات و تراجم نے ان کے حفظ و ضبط عدالت و ثقاہت کا اعتراف کیا ہے اور ان کو متقن، حجت، ثقہ اور ثابت لکھا ہے۔ {۳}

فقہی مسلک

امام نوویؒ امام محمد بن ادریس شافعیؒ کے مسلک سے وابستہ تھے اور ان کا شمار اکابر فقہاء اور شوافع کے شیوخ میں ہوتا تھا۔ انہوں نے شافعی مذہب کی گوناگوں خدمات سرانجام دیں۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں :

"شافعی مذہب کی تحقیق و تصحیح، ضبط و تنقیح، تحریر و تدوین اور ترتیب و تہذیب میں ان کا بڑا حصہ ہے اور وہ اس مذہب کے چوٹی کے علماء میں تھے۔ {۴}

علوم اسلامیہ میں جامعیت

امام نوویؒ کو "علم حدیث" میں خاص امتیاز حاصل تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم میں بھی ان کی ژرف نگاہی مسلم تھی۔ علوم قرآن، فقہ و افتاء، لغت،

عربیت اور نحو صرف میں بھی ان کو کمال حاصل تھا۔

قرآن مجید اور اُس کے متعلقہ علوم میں ان کو مکمل دسترس حاصل تھی۔ قراءت و تجوید' علم تفسیر میں ان کو خاص درک تھا' اور ان علوم کی تحصیل آپ نے مشاہیر فضلاء سے کی تھی {۵}۔ اس کے علاوہ امام نووی لغت' عربیت' نحو صرف اور منطق و فلسفہ سے بھی اشتغال رکھتے تھے اور ان علوم کے ماہرین سے ان کی تحصیل کی تھی {۶}۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام نووی جامع کمالات تھے اور متعدد علوم میں دسترس رکھتے تھے۔ امام یافعیؒ نے لکھا ہے کہ "امام نووی فقہ و حدیث کے علاوہ دیگر علوم و فنون میں بھی ممتاز تھے"۔ {۷}

حدیث کی طرح فقہ و افتاء میں ان کو کمال حاصل تھا اور اس فن میں ان کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ علمائے طبقات و تراجم نے لکھا ہے کہ

> "حدیث کی طرح فقہ و افتاء میں ان کو امتیاز حاصل تھا۔ وہ شافعی مذہب کے معتمد اور لائق اعتبار مفتی اور صاحب کمال امام تھے۔ شافعی مذہب کی ترقی و ترویج میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ اور اس مذہب کے چوٹی کے علماء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ {۸}

فضل و کمال

امام نوویؒ بڑے متدین اور عابد و زاہد تھے۔ بڑے عبادت گزار تھے' ذکر الٰہی میں ہمہ وقت مشغول رہتے تھے۔ ورع اور تقویٰ و طہارت میں بے مثال تھے۔ بڑے متقی اور پرہیزگار تھے۔ زہد و قناعت' اتباع سنت' اقتدائے سلف اور نیکی و اصلاح میں ممتاز تھے۔ ارباب سیر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے :

> "امام نوویؒ نے مجاہدہ' تزکیہ نفس' مراقبہ' تصفیہ باطن' تقویٰ و طہارت اور معمولی اور جزئی باتوں میں احتیاط کو اپنے اوپر لازم کر لیا تھا اور اپنی خواہشات نفس کو یکسر پامال کر دیا تھا۔ بہت بڑے عابد و زاہد' متورع' باعمل' شب بیدار' حامی دین و ناصر سنت تھے۔ ان کا تمام وقت عبادت و ریاضت' تلاوت قرآن مجید اور تصنیف و تالیف میں بسر ہوتا تھا۔ ہر وقت نیکی کے کاموں میں مشغول رہتے تھے۔ اتباع سنت اور اقتدائے سلف ان کی زندگی کا دستور تھا۔ انہوں نے اپنی

زندگی اسلامی علوم، خصوصاً حدیث و سنت کی خدمت و اشاعت میں گزار دی اور اُنکی اصل دلچسپی کا مرکز فقہ و حدیث تھا۔"{۹}

امام نووی زہد و اتقاء کی بنا پر صبر و قناعت کی زندگی گزارنے کے عادی ہو گئے تھے۔ سادگی اور قناعت میں ممتاز تھے۔ کھانے پینے اور لباس و پوشاک میں سادگی پسند کرتے تھے۔ دنیاوی تعیشات سے ان کو سخت نفرت تھی۔ علامہ ابن عماد حنبلی نے لکھا ہے کہ

"امام نووی نہایت قانع اور تھوڑے پر گزر اوقات کرنے والے تھے۔ اللہ کا دیا جو کچھ میسر آجاتا، اسی پر راضی رہتے۔ معمولی لباس اور مختصر ساز و سامان پر اکتفا کر لیتے تھے۔ تقلیل، قناعت اور عسرت زندگی میں اُنکی کوئی مثال نہ تھی۔"{۱۰}

امام نوویؒ سیرت و کردار کے لحاظ سے بھی بڑے ممتاز تھے۔ یافعی نے لکھا ہے :

"امام نووی بہترین اوصاف و خصائل اور پاکیزہ سیرت و اخلاق سے متصف اور محاسن و کمالات میں عدیم النظیر تھے"۔{۱۱}

امام نووی فریضہ امربالمعروف و نہی عن المنکر سے تمام عمر غافل نہیں رہے۔ بڑے جری، حق گو اور بیباک تھے اور اپنی گوناگوں تصنیفی مصروفیات کے باوجود اصلاح خلق اور امر بالمعروف کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ تقریری اور تحریری دونوں طریقوں سے امربالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں :

"امام نووی اپنی گوناگوں مصروفیتوں اور علمی اشغال کے باوجود اصلاح خلق اور امربالمعروف کا فریضہ بھی انجام دیتے، بادشاہوں اور ظلم و جفا پرور لوگوں کے روبرو حق بات کہتے اور ان کے غلط کاموں پر سخت رد و نکیر فرماتے۔ انہوں نے سلاطین و امراء کو خطوط لکھ کر امور خیر کی تلقین کی اور معاصی سے بچنے کی دعوت دی۔"{۱۲}

اِعترافِ فضل و کمال

امام نووی کے فضل و کمال اور اُن کی عظمت و جامعیت کا علمائے فن، اربابِ سیر اور تذکرہ نگاروں نے اِعتراف کیا ہے اور ان کی عظمت و جامعیت پر تمام علمائے فن کا اتفاق ہے۔ امام ذہبی نے ان کو امام، حافظ، یکتائے روزگار، شیخ الاسلام اور سرتاج اولیاء لکھا

ہے {۱۳}۔ علامہ ابن سبکی نے ان کو شیخ الاسلام' علامہ' اللہ تعالیٰ کی حجت و برہان' طریقہ اسلاف کے داعی' کے القاب سے یاد کیا ہے {۱۴}۔ یافعی نے ان کو الامام' شیخ الاسلام' المحقق' المدقق' النجیب' الحبر' المفید' وسیع المعرفت عالم' فاضل یگانہ' ولی کبیر' سید شہیر' تمام معاصرین سے فائق و برتر لکھا ہے۔ {۱۵} حافظ ابن کثیر نے شیخ محی الدین' علامہ وقت' مذہب شافعی کے شیخ' جلیل القدر فقیہ و محدث کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ {۱۶} علامہ ابن عماد حنبلی نے ان کو شیخ الاسلام' امام اور فاضل و عالم لکھا ہے۔ {۱۷} علامہ مرتضیٰ زبیدیؒ لکھتے ہیں کہ "امام نووی لوگوں پر اللہ کی حجت' اپنے زمانے کے قطب' سید دوراں اور اللہ کی مخلوقات کے درمیان اس کا راز تھے۔" {۱۸}

فقہی مذہب اور انصاف پسندی

امام نووی شافعی المذہب تھے اور ان کا شمار اس مذہب کے اساطین میں ہوتا تھا' مگر اس کے ساتھ ساتھ امام نووی بہت بڑے انصاف پسند تھے اور ان کو اپنے مذہب کے علماء سے اختلاف کرنے اور دوسرے مذاہب کے ائمہ کے اقوال نقل کرنے میں کوئی امر مانع نہ تھا۔ علامہ ابن سبکی اور امام یافعیؒ لکھتے ہیں کہ

> "امام نووی عقیدہ و مسلک کے اعتبار سے سلف صالحین اور اہل سنت والجماعت کے مذہب پر سختی سے عمل پیرا تھے۔ حدیث و سنت کی اتباع اور سلف کے مسلک کی ہمنوائی اور اس کی دعوت و تلقین ان کا اصلی طغرائے امتیاز تھا اور وہ طریقہ اسلاف کے داعی اور متقدمین اہل سنت والجماعت کے متبع تھے"۔ {۱۹}

نام و نسب

امام نووی کا نام یحییٰ بن شرف' کنیت ابو زکریا اور لقب محی الدین تھا۔ {۲۰}

ولادت و وطن

محرم ۶۳۱ھ میں ملک شام کے ایک قصبہ حوران میں پیدا ہوئے اسی کی نسبت سے نووی مشہور ہوئے۔ {۲۱}

اساتذہ

امام نووی نے جن ارباب کمال سے علوم اسلامیہ میں تحصیل کی ان کی فہرست حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں درج کی ہے۔ {۲۲}

تحصیل علم

امام نووی ۶۴۹ھ میں دمشق تشریف لے گئے۔ یہاں آپ نے باقاعدہ علم و فن کی تحصیل کی۔ دو سال بعد اپنے والد کے ہمراہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے' اور مدینہ کے دو ماہ کے قیام کے دوران فضلائے مدینہ سے بھی استفادہ کیا۔

پھر وطن واپس آکر پورے انہماک کے ساتھ تعلیم میں مشغول ہو گئے اور آخر میں بیت المقدس کی زیارت بھی کی۔ {۳۲}

فراغتِ تعلیم کے بعد

فراغت تعلیم کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور شام کے مختلف دینی مدارس میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے اور دارالحدیث اشرفیہ کے شیخ الحدیث بھی رہے۔ مدرسہ اقبالیہ دمشق میں علامہ ابن خلکان کے جانشین مقرر ہوئے اور ان کے انتقال کے بعد درس و تدریس کی خدمات انجام دیں۔ {۲۴}

تلامذہ

امام نووی کے تلامذہ کی فہرست بھی طویل ہے۔ حافظ ذہبی نے ان کے مشہور تلامذہ کی فہرست تذکرۃ الحفاظ میں درج کی ہے۔ {۲۵}

وفات

امام نووی نے ۲۴/ رجب ۶۷۶ھ کو ۴۵ سال کی عمر میں اپنے وطن میں انتقال کیا۔ متعدد شعرائے کرام نے ان کے انتقال پر مرثیے لکھے۔ {۲۶}

تصنیفات

امام نووی نے ۴۵ سال کی عمر پائی مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے علمی کاموں میں برکت دی۔ وہ ساری زندگی علم و فن کی خدمت میں مصروف رہے۔ ارباب سیر اور تذکرہ نگاروں نے امام نووی کی تصنیفات کی تعریف و توصیف کی ہے۔ علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں کہ

"اہل بصیرت سے یہ مخفی نہیں کہ امام نووی اور ان کی تصنیفات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت اور توجہ شامل حال رہی ہے۔" {۲۷}

امام یافعی فرماتے ہیں کہ

"امام نووی پر خدا کی برکتیں ان کی کتابوں کے ذریعہ ظاہر ہوئیں۔ چنانچہ ان سب کو بڑا قبول حاصل ہوا اور ہر ملک میں ان کی شہرت ہوئی اور لوگ ان سے خوب فیض یاب ہوئے۔ {۲۸}

طاش کبریٰ زادہ لکھتے ہیں کہ

"امام نووی کی کتابیں بیش قیمت اور یادگار ہیں اور فن حدیث میں ان کی کتابوں کی تعداد زیادہ ہے۔" {۲۹}

امام نووی کی تصنیفات کی تعداد

حاجی خلیفہ چلپی نے اپنی کتاب "کشف الظنون" میں امام نووی کی تصنیفات کی تعداد ۲۸ بتائی ہے۔ ذیل میں چند مشہور تصانیف کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے :

طبقات الشافعیہ : علامہ ابن صلاح کی کتاب طبقات الشافعیہ کا مختصر ہے۔ امام صاحب نے اس پر کسی قدر اضافے بھی کئے ہیں۔ {۳۰}

الاصول والضوابط فی المذاہب : ان اہم فقہی اصول و قواعد اور مفید مطالب پر مشتمل ہے جو اس فن کے طلبہ کے لئے ضروری ہیں۔ {۳۱}

الارشاد فی علوم الحدیث : علامہ ابن صلاح کی مشہور کتاب مقدمہ ابن صلاح کا مختصر ہے۔ {۳۲}

التقریب والتیسیر فی مصطلح الحدیث : یہ کتاب الارشاد کا مختصر ہے۔ {۳۳}

شرح البخاری : صرف کتاب الایمان تک لکھی گئی۔ مقدمہ شرح مسلم میں امام نوویؒ تحریر فرماتے ہیں :

"میں نے شرح بخاری میں گوناگوں معلومات جمع کی ہیں۔ یہ مختصر ہونے کے باوجود مفید و متنوع علوم و فوائد پر مشتمل ہے۔" {۳۴}

ریاض الصالحین : ترغیب و ترہیب اور زہد و ریاضت نفس سے متعلق احادیث کا مختصر مجموعہ ہے۔ معتبر اور مفید ہونے کی وجہ سے اس کتاب کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ دینی مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔ علمائے کرام نے اس کتاب کا اردو میں بھی ترجمہ کیا ہے۔ مولانا سید عبد الاول غزنوی اور مولانا محمد صادق خلیل کے تراجم بہت مشہور و معروف ہیں۔

شرح المہذب : یہ امام ابو اسحاق شیرازی کی مشہور اور عظیم الشان کتاب المہذب فی الفروع کی شرح ہے۔ یہ کتاب احکام و مسائل میں بڑی جامع اور پُر از معلومات ہے۔ امام نووی نے اپنی شرح صحیح مسلم میں جابجا اس کا حوالہ دیا ہے۔ حافظ ابن کثیر اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"امام نووی نے اس شرح پر غیر معمولی جدت و اختراع اور نقد و تحقیق سے کام لیا ہے۔ غریب الفاظ کی تحقیق، فقہی و حدیثی معلومات اور گوناگوں دوسرے اہم امور و مسائل ایسے جمع کر دیئے ہیں جو دوسری کتابوں میں نہیں ملتے۔ مجھے اس سے بہتر فقہی کتاب کا علم نہیں۔ {۳۵}

امام نووی نے اپنی اس کتاب کی حدیثوں کی تلخیص بھی کی تھی جس کا نام "الخلاصہ فی الحدیث" رکھا۔ {۳۶}

اربعین : اربعینات کتب حدیث کی ایک مشہور قسم ہے۔ اس حدیث نبویؐ کے بموجب جس میں ۴۰ احادیث جمع کرنے کی فضیلت وارد ہوئی ہے، اکثر محدثین کرام اور علمائے عظام نے چالیس حدیثوں کے مجموعے مرتب کرنے کی طرف توجہ دی۔

مختلف علمائے کرام نے مختلف اغراض و مقاصد کے تحت اربعینات مرتب فرمائے۔ بعض نے توحید و صفات الٰہی کی ۴۰ احادیث جمع کیں۔ بعض نے اصول و مہمات دین کی

روایات کو اکٹھا کیا۔ بعض نے جہاد، اور بعض نے زہد و مواعظ اور بعض نے آداب و اخلاق اور بعض نے فضائل وغیرہ کے متعلق چالیس احادیث جمع کیں۔ امام نووی کا مجموعہ ان گوناگوں اغراض و امور کا جامع ہے۔ امام نووی اپنی اس کتاب کے بارے میں خود فرماتے ہیں :

"وهي اربعون حديثًا مشتملةٌ على جميع ذلك وكل حديث منها قاعدةٌ عظيمةٌ من قواعد الدين"۔

"یہ چالیس حدیثیں ان سب امور کو شامل ہیں اور ان میں ہر ہر حدیث دین کے کسی عظیم الشان قاعدہ پر مبنی ہے"۔

امام نووی نے اپنی اس کتاب میں صحیح احادیث جمع کی ہیں۔ اور ان میں اکثر روایات صحیح بخاری و صحیح مسلم سے ماخوذ ہیں۔ اختصار کے خیال سے سندیں حذف کر دی ہیں اور ۴۰ کی بجائے ۴۲ حدیثیں جمع کی ہیں۔

اربعین نووی کی اہمیت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی بے شمار شرحیں لکھی گئی ہیں۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے اس کی ۲۱ شروح کے نام لکھے ہیں۔ {۳۷}

مشہور شارحین میں خود امام نووی، ابن رجب بغدادی، ابن حجر ہیثمی، ملا علی قاری، شیخ علی بن ملقن شافعی، ابن حجر عسقلانی اور حافظ ابن عبد الباری شامل ہیں۔

کتاب الاذکار : یہ امام نووی کی مشہور و معروف کتاب ہے۔ اس میں حدیث کی کتابوں سے شب و روز کے اشغال و اذکار اور دعائیں جمع کی گئی ہیں۔ امام نووی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں :

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے : ﴿ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ... ﴾ (البقرہ) "سو مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا"۔ دوسری جگہ ارشاد ہے : ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝ ﴾ (الذاریات) "میں نے جن و انس کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا"۔ ان آیات سے ثابت ہوا کہ بندہ کی سب سے عمدہ اور بہتر حالت وہی ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے اور ان اذکار و اعمال میں مشغول ہو جاتا ہے جو رسول اللہ ﷺ سے وارد ہیں ـــــ اس لئے میں نے یہ مختصر کتاب تالیف کی۔ {۳۸}

تہذیب الاسماء واللغات : اس کتاب میں اسماء و اعلام کے الفاظ و لغات کی تشریح و توضیح کی گئی ہے۔ اور اس کو امام نووی نے بڑی محنت اور تحقیق سے لکھا ہے۔

شرح صحیح مسلم : اس کتاب کا اصل نام "المنہاج شرح صحیح مسلم" ہے اور امام نووی کی یہ بہت اہم اور شہرۂ آفاق تصنیف ہے۔ صحیح مسلم کی متعدد شرحیں مکمل کی گئیں مگر جو مقبولیت اور شہرت اس شرح کو حاصل ہوئی وہ کسی اور شرح کو نہیں ہوئی۔ امام نووی کی یہ شرح نہ تو مطول و مفصل ہے اور نہ مختصر و مجمل بلکہ متوسط ہے۔ اس کے شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں صحیحین خصوصاً صحیح مسلم کی خصوصیت و اہمیت' امام مسلم کی حدیث میں عظمت و برتری' غیر معمولی احتیاط و کاوش اور دقت نظر وغیرہ کے علاوہ اصول درایت و فن حدیث کے مباحث تحریر کئے گئے ہیں۔

حواشی

{۱} ذہبی : تذکرۃ الحفاظ' ج ۴' ص ۲۴۲ {۲} یافعی : مرءاۃ الجنان' ج ۴' ص ۱۸۴

{۳} ابن سبکی : طبقات الشافعیہ' ج ۵' ص ۳۵۷۔ ابن کثیر : البدایہ والنہایہ' ج ۱۳' ص ۲۷۸

{۴} ذہبی : تذکرۃ الحفاظ' ج ۴' ص ۲۴۲ {۵} ابن سبکی : طبقات الشافعیہ' ج ۵' ص ۳۵۷

{۶} ابن کثیر : البدایہ والنہایہ' ج ۱۳' ص ۲۷۱ {۷} یافعی : مرءاۃ الجنان' ج ۴' ص ۱۸۴

{۸} ابن سبکی : طبقات الشافعیہ' ج ۵' ص ۳۵۷۔ ابن کثیر : البدایہ والنہایہ' ج ۱۳' ص ۲۷۱ یافعی : مرءاۃ الجنان' ج ۴' ص ۱۸۴

{۹} ذہبی : تذکرۃ الحفاظ' ج ۴' ص ۲۶۰' ۲۶۱۔ یافعی : مرءاۃ الجنان' ج ۴' ص ۱۸۱ تا ۱۸۶۔

{۱۰} ابن عماد : شذرات الذہب' ج ۵' ص ۳۵۶ {۱۱} یافعی : مرءاۃ الجنان' ج ۴' ص ۱۸۲

{۱۲} ذہبی : تذکرۃ الحفاظ' ج ۴' ص ۲۶۳ {۱۳} ذہبی : تذکرۃ الحفاظ' ج ۴' ص ۲۴۴

{۱۴} ابن سبکی : طبقات الشافعیہ' ج ۵' ص ۱۶۶ {۱۵} یافعی : مرءاۃ الجنان' ج ۴' ص ۱۸۴

{۱۶} ابن کثیر : البدایہ والنہایہ' ج ۱۳' ص ۲۷۸ {۱۷} ابن عماد : شذرات الذہب' ج ۵' ص ۳۵۵

{۱۸} زبیدی : تاج العروس

{۱۹} ابن سبکی : طبقات الشافعیہ' ج ۵' ص ۱۶۶۔ یافعی : مرءاۃ الجنان' ج ۴' ص ۱۸۶

{۲۰} ابن کثیر : البدایہ والنہایہ' ج ۱۳' ص ۲۷۸ {۲۱} صدیق حسن خان : اتحاف النبلاء' ص ۴۳۹

{۲۲} ذہبی : تذکرۃ الحفاظ' ج ۴' ص ۲۶۱ {۲۳} ایضاً

{۲۴} ابن کثیر : البدایہ والنہایہ' ج ۱۳' ص ۲۷۹ {۲۵} ذہبی : تذکرۃ الحفاظ' ج ۴' ص ۲۶۱

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

تصوّرِ دُعا

تورات اور قرآن کی روشنی میں

پروفیسر ڈاکٹر محمد آصف ہزاروی' لاہور

دعا مانگنا انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ چنانچہ جب ہم مبتلائے آلام ہوتے ہیں اور مصیبتیں چاروں طرف سے ہمیں گھیر لیتی ہیں تو ہمارے ہاتھ دعا کے لئے بے اختیار اٹھ جاتے ہیں۔ دل مضطرب سے بے ساختگی کے عالم میں نکلی ہوئی یہی آواز دعا کہلاتی ہے۔ قرآن کریم نے انسان کی اس فطرت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے :

﴿ وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ... ﴾ (الزمر : ۸)

"اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے پروردگار کو پکارتا ہے"۔

تاریخ مذاہب کی ورق گردانی سے بھی یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ ہر مذہب نے اپنی تعلیمات میں دعا کو بنیادی جگہ دی ہے۔ انسانی تاریخ اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ دعا کا تصور قدیم ترین تصور ہے اور نظری و عملی دونوں صورتوں میں اب تک موجود ہے۔ تورات کی کتاب پیدائش میں جن انبیاء کرام کا ذکر ملتا ہے ان کی چند دعاؤں کا بھی تذکرہ ہے۔ انہی انبیاء کرام کی دعائیں قرآن مجید میں بھی موجود ہیں۔ پیش نظر مضمون میں ان کا ایک باہمی موازنہ پیش کیا جاتا ہے۔

کتاب پیدائش میں "خدا کا نام لینا" کے الفاظ سے مراد دعا ہے۔ چنانچہ قاموس الکتاب میں لکھا ہے :

"بزرگوں کے زمانے میں خدا کا نام لینا دعا تھا۔ پروٹسٹنٹ ترجموں میں ان حوالوں میں جہاں بھی لفظ دعا آیا ہے وہاں عبرانی میں "نام لینا" ہے یعنی صرف خدا کا پاک نام لینا ہی ایک دعا ہے اور خدا سے مدد کی درخواست ہے"۔ {۱}

اس کی چند ایک مثالیں حسب ذیل ہیں :

"اور شیث کا بھی ایک بیٹا ہوا اُس کا نام اُس نے انوش رکھا اور یہی خدا کا نام لینے لگا"۔(پیدائش' ۴ : ۲۶){۲}

"تب خداوند ابرام پر ظاہر ہوا اور کہا یہ زمین میں تیری نسل کو دوں گا... اُس نے خدا کیلئے ایک قربان گاہ بنائی اور خدا کا نام لیا"۔ (۱۲ : ۷'۸)

دعا کا قربانی کے ساتھ ایک گہرا تعلق ہے۔ اس تعلق کے متعلق خیراللہ خان نے لکھا ہے کہ

"دعا کا قربانی سے بھی ایک قریبی تعلق ہے۔ قربانی کے سلسلے میں دعا انسان اور خدا کی مرضی کی ہم آہنگی ظاہر کرتی ہے"۔{۳}

کتاب پیدائش سے قربانی اور دعا کے تعلق کی مثال :

"اس جگہ جہاں اس (ابرام) نے پہلے قربان گاہ بنائی تھی وہاں اُس نے خداوند کا نام لیا"۔ (۱۳: ۴)

"تب اس (اسحاق) نے وہاں ایک مذبح بنایا اور خدا کا نام لیا"۔(۲۶ : ۲۵)

کتاب پیدائش میں مذکور دعائیں :

۱) "جب نوح مے کے نشے سے ہوش میں آیا تو جو کچھ اُس کے چھوٹے بیٹے نے اس کے ساتھ کیا تھا جانا۔ تب وہ بولا کنعان ملعون ہو وہ اپنے بھائیوں کے غلاموں کا غلام ہو۔ پھر کہا خداوند سام کا خدا مبارک ہو کنعان اُس کا غلام ہو خدا یافث کو پھیلائے کہ وہ سام کے خیموں میں بسے کنعان اس کا غلام ہو"۔(۹ : ۲۴'۲۵)

۲) "ابرام نے کہا اے خداوند خدا تو مجھے کیا دے گا حالانکہ میں بے اولاد جاتا ہوں اور میرے گھر کا مختار الیعاذ دمشقی ہے۔ پھر ابرام نے کہا تو نے مجھے فرزند نہ دیا اور دیکھ میرا خانہ زاد نوکر میرا وارث ہو گا"۔(۱۵ : ۲'۳)

۳) "اور ابراہیم نے خدا سے کہا کہ کاش کہ اسماعیل تیرے حضور جیتا رہے"۔ (۱۷ : ۱۸)

۴) "ابراہیم خداوند کے سامنے ہی کھڑا رہا اور نزدیک جا کر اُس سے کہا کیا تو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کرے گا؟ اگر پچاس راست باز آدمی اس شہر میں ہوں کیا وہ بھی سب کے ساتھ ہلاک ہوں گے۔ اور ان پچاس راست بازوں کی خاطر اگر وہ وہاں ہوں تو کیا تو اسے چھوڑ دے گا؟.... اور ابراہیم نے جواب دے کر کہا کہ دیکھ میں نے اپنے مالک کے سامنے بولنا شروع کیا اگرچہ میں خاک ہوں اور راکھ ہوں.

... اگر وہاں دس پائے جائیں وہ بولا دس کی خاطر بھی اسے نیست نہ کروں گا"۔
(۱۸ : ۲۳تا۳۲)

۵) "اور جب ابرائیم نے دعا مانگی تو خدا نے اپنی ملک اور اس کی بیوی اور اس کی لونڈی کو شفادی اور ان کے لڑکے پیدا ہوئے"۔(۲۰ : ۱۷)

۶) "پھر اسحاق نے اپنی بیوی کے لئے خداوند سے دعا مانگی کیونکہ وہ بانجھ تھی اور خداوند نے اس کی دعا قبول کی"۔(۲۵ : ۲۱)

۷) یعقوب نے دھوکہ سے عیسو بن کر اپنے باپ سے عیسو کی برکت حاصل کی اس پر اسحاق کی دعا : "دیکھ میرے بیٹے کی خوشبو اس کھیت کی خوشبو کی مانند ہے جسے خداوند نے برکت دی خداوند فلک سے اوس اور زمین کی زرخیزی تجھے بخشے اناج اور مے کی افراط' قومیں تیری خدمت کریں گی گروہیں تیرے آگے خمیدہ ہوں' تو اپنے بھائیوں کا آقا ہو تیری ماں کے بیٹے تیرے آگے خمیدہ ہوں' ملعون جو تجھے ملعون کہے مبارک جو تجھے مبارک کہے"۔(۲۷ : ۲۷تا۲۹)

۸) اسحاق کی دعا عیسو کے لئے :

"دیکھ زمین کی زرخیزی سے الگ اور آسمان کی اوس کے کنارے تیرا قیام ہوگا تو اپنی تلوار کے ذریعے گزارہ کرے گا اور اپنے بھائی کا خدمت گزار رہے گا مگر جب تو زور پکڑے گا تو اسکا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکے گا"(۲۷ : ۳۹'۴۰)

۹) حضرت یعقوب کی دعا حضرت یوسف کے بیٹوں کے لئے :

"اور وہ خدا جس کے روبرو چلے میرے آباء ابرائیم اور اسحاق جس نے آج کے دن تک عمر بھر میری پاسبانی کی وہ فرشتہ کہ جس نے مجھے ہر مصیبت سے بچایا۔ ان لڑکوں کو برکت عطا فرمائے جو میرے نام سے اور میرے آباء ابرائیم اور اسحاق کے نام سے نامزد ہوں وہ زمین میں برومند ہوں اور زیادہ سے زیادہ بڑھ جائیں"۔(۴۸ : ۱۵'۱۶)

قرآن کریم میں مذکور دعائیں :

کتاب پیدائش میں جن انبیاء کرام کے حالات یا دعائیں مذکور ہیں ذیل میں انہی انبیاء کرام کی قرآن مجید میں مذکور دعاؤں میں سے چند اہم دعائیں بیان کی جاتی ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کی دعا :

﴿ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ ﴾ (الاعراف : ۲۳)

"دونوں عرض کرنے لگے کہ پروردگار ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں نہیں بخشے گا اور ہم پر رحم نہیں کرے گا تو ہم تباہ ہو جائیں گے"۔

حضرت نوح علیہ السلام کی دعا :

﴿ وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِىْ مِنْ اَهْلِىْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحَاكِمِيْنَ ۝ ﴾ (ھود : ۴۵)

"اور نوح نے اپنے پروردگار کو پکارا اور کہا پروردگار میرا بیٹا بھی میرے گھر والوں میں ہے (تو اسے نجات دے) تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب سے بہتر حاکم ہے"۔

﴿ وَقَالَ رَبِّ اِنِّىْ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْئَلَكَ مَا لَيْسَ لِىْ بِهٖ عِلْمٌ ' وَاِلَّا تَغْفِرْلِىْ وَتَرْحَمْنِىْ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ ﴾ (ھود : ۴۷)

"اور نوح نے کہا پروردگار میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ ایسی چیز کا تجھ سے سوال کروں جس کی حقیقت مجھے معلوم نہیں اور اگر تو مجھے نہیں بخشے گا اور مجھ پر رحم نہیں کرے گا تو میں تباہ ہو جاؤں گا"۔

﴿ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِىْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ۝ ﴾ (المومنون : ۲۶)

"(نوح نے) کہا پروردگار انہوں نے مجھے جھٹلایا ہے میری مدد فرما"۔

﴿ فَدَعَا رَبَّهٗ اَنِّىْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ۝ ﴾ (القمر : ۱۰)

"اپنے پروردگار سے دُعا کی میں کمزور ہوں تو مدد فرما"۔

﴿ وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝ رَبِّ اغْفِرْلِىْ وَلِوَالِدَىَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِىَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ' وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ۝ ﴾ (نوح : ۲۶ تا ۲۸)

اور نوح نے دُعا کی "اے میرے پروردگار کسی کافر کو روئے زمین پر بستا نہ رہنے

دے۔ اگر تو اُن کو رہنے دے گا تو تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور اُن سے جو اولاد ہو گی وہ بھی بد کار اور ناشکر گزار ہو گی۔ اے پروردگار مجھ کو' میرے ماں باپ کو اور جو ایمان لا کر میرے گھر میں آئے اس کو اور تمام ایمان والے مَردوں اور عورتوں کو معاف فرما اور ظالم لوگوں کے لئے تباہی بڑھا"۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا :

﴿ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ (البقرہ : ۱۲۶)

"اور جب ابراہیم نے دُعا کی اے پروردگار اس جگہ کو امن کا شہر بنا کر اس کے رہنے والوں کو' جو خدا اور آخرت پر ایمان لائیں' کھانے کو میوے عطا فرما"۔

﴿ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ' وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا.. ﴾
(البقرہ : ۱۲۷' ۱۲۸)

"اے پروردگار ہم سے یہ خدمت قبول فرما' بے شک تو سننے اور جاننے والا ہے۔ اے پروردگار ہم کو اپنا فرمانبردار بنائے رکھنا اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک گروہ کو مطیع بنائے رکھنا اور ہمیں طریق عبادت بتا....."

﴿ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ ﴾ (الصافات : ۱۰۰)

"اے رب مجھے (اولاد) عطا فرما جو سعادت مندوں میں سے ہو"۔

حضرت لوط علیہ السلام کی دُعا :

﴿ رَبِّ نَجِّنِيْ وَاَهْلِيْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ ○ ﴾ (الشعراء : ۱۶۹)

"اے پروردگار مجھے اور میرے گھر والوں کو ان کے کاموں سے نجات عطا فرما۔"

﴿ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ○ ﴾ (العنکبوت : ۳۰)

"اے پروردگار مجھے ان مفسد لوگوں کے مقابلے میں مدد عطا فرما۔"

حضرت یوسف علیہ السلام کی دُعا :

﴿ رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ'

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ' اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ' تَوَفَّنِی مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ○ ﴾ (یوسف : ۱۰۱)

"اے میرے پروردگار تو نے مجھے حکومت عطا کی اور خوابوں کی تعبیر کا علم بخشا' آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے تو ہی دنیا و آخرت میں میرا کارساز ہے۔ مجھے (دنیا سے) اپنی اطاعت میں اٹھا اور اپنے نیک بندوں میں داخل فرمانا"۔

تقابلی جائزہ :

کتاب پیدائش کے تصورِ دعا کا ذیل میں قرآنی دعاؤں سے موازنہ پیش کیا جاتا ہے :

۱) کتاب پیدائش میں حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور لکھا ہے کہ ان کی لغزش کی وجہ سے خدا نے فرمایا "زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی" (۳ : ۱۷) لیکن کہیں بھی ذکر نہیں کیا کہ آدم علیہ السلام نے اس لغزش پر خدا سے دعا یا استغفار اور اپنی اس غلطی پر ندامت کا اظہار کیا ہو' جبکہ قرآن مجید بیان فرماتا ہے کہ خدا نے آدم علیہ السلام کی توبہ کو قبول فرمایا اور تفصیل کے ساتھ ان دعاؤں کا ذکر بھی کیا جو اس ضمن میں مانگی گئیں۔

۲) کتاب پیدائش کی دعائیں مادیت سے بھری پڑی ہیں جبکہ روحانیت کا ان میں ذکر تک نہیں ہے۔ مثلاً حضرت اسحاق علیہ السلام نے جو دعا اپنے بیٹے کے لئے مانگی اس میں ہے' اناج' زمین کی زرخیزی' قوموں کا مطیع ہونا اور بھائیوں کے جھکنے کا تو ذکر ہے لیکن آخرت کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔ اسی طرح حضرت اسحاق علیہ السلام کی دعا جو عیسو کے لئے ہے خالصتاً مادیت سے بھری ہوئی ہے۔ یوسف علیہ السلام کے بیٹوں کے لئے جو دعا یعقوب علیہ السلام نے کی اُن میں صرف دنیاوی فوائد' مال و دولت جمع کرنے کا ذکر ہے۔ اخروی معاملات' عبادت' تقویٰ وغیرھم کا نہیں ذکر نہیں ہے' لیکن قرآنی دعائیں روحانیت و مادیت کا بہترین امتزاج ہیں مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ملاحظہ ہو :

﴿ رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْ

اِلَیْھِمْ وَارْزُقْھُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّھُمْ یَشْکُرُوْنَ○ ....
.... اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ وَھَبَ لِیْ عَلَی الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ ...
رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ○ رَبَّنَا اغْفِرْلِی وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ○ ﴾ (ابراھیم : ۳۷ تا ۴۱)

"پروردگار' میں نے ایک بے آب : گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ (میں نے یہ اس لئے کیا ہے) کہ لوگ یہاں نماز قائم کریں۔ لہٰذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انہیں کھانے کو پھل دے' شاید کہ یہ شکر گزار بنیں.....
شکر ہے اللہ کا جس نے مجھے اس بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحٰق جیسے بیٹے دیئے.....
پروردگار' میری دُعا قبول کر۔ پروردگار' مجھے اور میرے والدین کو اور سب ایمان لانے والوں کو اس دن معاف کر دینا جبکہ حساب قائم ہو گا۔"

اِس دُعا میں روحانیت و مادیت کا اعلیٰ ترین امتزاج نظر آتا ہے' ایک طرف صالح اولاد کے لئے دُعا ہے' دوسری طرف صالحین کی صحبت' آخرت میں ذکر خیر' اقامت الصلوۃ کا ذکر اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے' نرینہ اولاد ملنے پر تشکر کے جذبات وغیرہ سبھی شامل ہیں۔ اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کی دُعا میں ایک طرف دنیاوی حکومت اور تعبیر خواب کے علم کا ذکر ہے تو دوسری طرف اسلام (تبلیغ و رضا) پر موت کے لئے دعا کی جا رہی ہے۔

۳) اللہ تعالیٰ نے تضرع' گڑگڑا کر دُعا مانگنے کا حکم دیا ہے۔ خشوع و خضوع کے ساتھ دُعا مانگنا دراصل اعتراف بندگی ہے' دُعا کی روح عجز و نیاز ہے' اگر اس کا اظہار نہ ہو تو وہ خالی الفاظ ہیں۔ اس لئے انتہائی عاجزی و انکساری سے دُعا مانگنے کا طریقہ بتایا گیا ہے :

﴿ اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَۃً ' اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ○ ﴾

(الاعراف : ۵۵)

"(لوگو) اپنے پروردگار سے عاجزی سے اور چپکے چپکے دُعائیں مانگا کرو وہ حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا"۔

حضرت زکریا علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے قرآن مجید نے فرمایا :

﴿ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِیًّا ○ ﴾ (مریم : ۳)

"جب انہوں نے اپنے پروردگار کو دبے الفاظ سے پکارا"۔

دُعا کے آداب میں یہ چیز بنیادی حیثیت رکھتی ہے کہ عاجزی' انکساری اور خشوع و خضوع کے ساتھ دُعا مانگی جائے۔ یہی قرآنی دُعاؤں کا اسلوب ہے۔ مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کی دُعا میں انتہائی عاجزی کا اظہار نظر آتا ہے جب وہ اپنی خطا کے لئے خدا سے توبہ کرتے ہیں۔ اس کے برعکس کتاب پیدائش کی دُعاؤں میں یہ پہلو نظر نہیں آتا۔ مثلاً :

"ابراہیم خداوند کے سامنے کھڑا رہا اور نزدیک جا کر یہ کہا کہ کیا تو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کرے گا"۔ (۱۸ : ۲۲'۲۳)

"اس نے کہا میں نے اپنے مالک کے سامنے بولنے میں گستاخی کی... تب اُس نے کہا خداوند خفا نہ ہو تا اگر فقط ایک دفعہ اور عرض کروں"۔ (۱۸ : ۳۱'۳۲)

۴) کتاب پیدائش کی دُعاؤں میں انبیاء کی شان' عظمت اور تقدس کا پتہ نہیں چلتا۔ مثلاً :

"اور یعقوب نے منت مانی اور کہا اگر خدا میرے ساتھ رہے اور اس راہ میں جس میں میں جاتا ہوں میری نگہبانی کرے اور مجھے کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑا دیتا رہے اور میں اپنے باپ کے گھر پر سلامت آؤں تب خداوند میرا خدا ہو گا"۔ (۲۸ : ۲۰تا۲۲)

مگر قرآنی دُعاؤں کے ایک ایک لفظ سے عظمت انبیاء کا پتہ چلتا ہے کہ اُن کو خدا نے کس مقام و مرتبہ پر فائز فرمایا ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہو حضرات ابراہیم علیہ السلام کی دُعا :

﴿ رَبِّ هَبْ لِیْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ○ وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ ○ وَاجْعَلْنِیْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِیْمِ ○ وَاغْفِرْ لِاَبِیْۤ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّیْنَ ○ وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ ○ ﴾

(الشعراء : ۸۳تا۸۷)

"اے رب مجھے حکم عطا کر اور مجھ کو صالحوں کے ساتھ ملا۔ اور بعد کے آنے والوں میں مجھ کو سچی ناموری عطا کر۔ اور مجھے جنت نعیم کے وارثوں میں شامل فرما۔ اور میرے باپ کو معاف کر دے کہ بے شک وہ گمراہ لوگوں میں سے ہے

اور مجھے اُس دن رسوا نہ کر جبکہ سب لوگ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے"۔

۵) اسلام اس بات پر زور دیتا ہے کہ جب بندہ دُعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہے تو دوسروں کے لئے بھی دُعا مانگے۔ ایسی دُعائیں جلد قبول ہوتی ہیں۔ انفرادی دُعا میں تو اپنی ذات سے آغاز مطلوب ہوتا ہے لیکن اجتماعی صورتوں میں سب کے لئے دُعا کرنا پسندیدہ فعل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنی دُعاؤں میں اجتماعیت پائی جاتی ہے۔ سب لوگ ان دُعاؤں کو مانگ سکتے ہیں۔ مگر کتاب پیدائش کی دُعاؤں میں انفرادیت ہے' کوئی اور شخص ان دُعاؤں کو ان الفاظ میں نہیں مانگ سکتا۔ مثلاً حضرت اسحاق علیہ السلام کی دُعا یعقوب علیہ السلام و عیسو اور یوسف علیہ السلام کے بیٹوں کے لئے۔ اس کے برعکس قرآنی دُعاؤں میں عموم ہے۔ مثلاً حضرت لوط علیہ السلام کی دُعا' حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آدم علیہ السلام کی دُعا' جسے آج بھی ہر شخص مانگ سکتا ہے اور مانگ رہا ہے۔ مثلاً:

﴿ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ ﴾ (الاعراف : ۲۳)

"اے رب' ہم نے اپنے اوپر ستم کیا' اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے۔"

۶) کتاب پیدائش میں اولاد کے حصول کے لئے ابراہیم علیہ السلام کی دُعا لکھی ہوئی ہے۔ قرآن مجید میں بھی یہ دُعا موجود ہے لیکن الفاظ کی شائستگی' مانگنے کا اسلوب اور دُعا کے وقار میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کہاں قرآنی الفاظ ﴿ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ ﴾ اور کہاں یہ الفاظ "خداوند تو مجھے کیا دے گا حالانکہ میں بے اولاد جاتا ہوں"۔ (۱۵ : ۲)

۷) دُعا چونکہ بندے اور رب کے درمیان گہرے تعلق کا سبب اور ذریعہ ہے لہٰذا دُعا اس یقین کے ساتھ مانگی جائے کہ رب اسے قبول کرتا ہے۔ چنانچہ اسلام نے اسی بات کی تلقین کی ہے کہ غافل دل سے دُعا نہ مانگی جائے کیونکہ خدا بے توجہ اور غافل دل کی دُعا کو قبول نہیں کرتا۔ لہٰذا ناامیدی کے ساتھ دُعا نہ کی جائے۔ چنانچہ قرآنی دُعاؤں میں اللہ کی ذات پر بھروسہ اور یقین کامل کا جذبہ نظر آتا ہے اور ہر دُعا میں خدا کی قدرت کاملہ

اور اس پر توکّل نمایاں نظر آتا ہے' مثلاً:

﴿ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ نَجّٰنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ○ وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ ○ ﴾ (المؤمنون : ۲۸' ۲۹)

"پس کہو : شکر ہے اللہ کا جس نے ہمیں ظالم لوگوں سے نجات دی۔ اور کہہ : پروردگار' مجھ کو برکت والی جگہ اتار اور تو بہترین جگہ دینے والا ہے۔"

جبکہ کتاب پیدائش کی دُعاؤں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا اقرار نظر نہیں آتا' مثلاً "ابرام نے کہا اے خداوند تو مجھے کیا دے گا"۔(۱۵ : ۲) "اور یعقوب نے منت مانی اور کہا اگر خدا میرے ساتھ رہے"۔(۱۸ : ۲۴)

۸) کتاب پیدائش باب نمبر ۲۷ میں دُعا کے بارے میں ایک عجیب و غریب تصور ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام اپنے بیٹے کو دُعا دینے کے لئے اسے شکار کا گوشت لانے کی ترغیب دیتے ہیں تاکہ پسندیدہ کھانا کھا کر دل سے دُعا دیں۔ یعنی مادی اشیاء کے بدلے دُعا دینے کا تصور ملتا ہے۔ اور یہ اشیاء نہ لانے پر دُعا نہیں ملے گی۔ جبکہ دوسری طرف نوح علیہ السلام کا بیٹا نافرمان ہے۔ قرآن پاک فرماتا ہے اس کے باوجود باپ بیٹے کو دُعا دیتا ہے کہ وہ اس کی دعوت کو تسلیم کر کے اس کے اوپر ایمان لے آئے۔

۹) قرآنی دُعاؤں سے پتہ چلتا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام ہر وقت امت کی اصلاح و فلاح کے لئے ہمیشہ فکرمند رہتے' خدا سے دُعائیں کرتے تاکہ امت سیدھے راستے پر آ جائے اور حق کو قبول کر لے۔ انبیاء کرام نے اپنی نسلوں کے لئے دُعائیں مانگی کہ وہ صراط مستقیم پر چلتی رہیں۔ جبکہ کتاب پیدائش میں دُعائیں اس فکر سے بالکل خالی ہیں۔ امت کی اصلاح' برائیوں سے روکنے اور لغزشوں سے پاک صاف رہنے اور دین الٰہی پر گامزن رہنے کے متعلق ایک بھی دُعا کسی نبی سے منسوب کتاب پیدائش میں نہیں ہے۔

۱۰) کتاب پیدائش کی دُعاؤں میں اخلاقی اوصاف نام کی کوئی چیز نہیں کہ ان میں صبر' عدل' ذکر و فکر اور تقویٰ کا ذکر ہو' جبکہ قرآنی دُعائیں اخلاقیات سے پُر ہیں اور اکثر کا تعلق اخروی زندگی سے ہے۔

۱۱) قرآنی دُعاؤں کا اسلوب یہ ہے کہ دُعا مانگنے والا پہلے خدا کی تسبیح و ثنا کرتا ہے' پھر

اپنی حاجت خدا کے حضور عرض کرتا ہے' جبکہ کتاب پیدائش کی دعاؤں میں شکایت کا پہلو نظر آتا ہے' مثلاً "کیا تو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کرے گا"۔ (۱۸ : ۲۴) جبکہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کا اسلوب دیکھئے :

﴿ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ نَجّٰنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝ ﴾

(المؤمنون : ۲۸)

"پس کہو : شکر ہے اللہ کا' جس نے ہمیں ظالم لوگوں سے نجات دی"۔

۱۲) جذبہ تشکر ایک ایسا پہلو ہے جو قرآنی دعاؤں میں موجود ہے۔ انبیاء کرام اعتراف نعمت کرتے ہیں اور خدا کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ تحدیث نعمت اور اظہارِ تشکر کا موضوع حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں میں نظر آتا ہے' بڑھاپے میں اولاد کے ملنے پر خدا کے احسانات کو یاد کرتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام حکومت ملنے پر تاویل حدیث کی تعلیم اور احسانات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اس طرح کا توکل' یقین محکم' للہیت کا تصور حضرت نوح علیہ السلام کی دعاؤں میں نظر آتا ہے کہ کفار کی تباہی کے لئے بد دعا کی تو اپنی ایذا رسانی کا ذکر تک نہ کیا۔ کتاب پیدائش کی دعاؤں میں یہ پہلو مفقود ہے۔

قرآنی دعاؤں سے پتہ چلتا ہے کہ جب اُمتوں نے انبیاء کرام کی تعلیم کو قبول نہ کیا تو انبیاء خدا کی بارگاہ میں جھک کر توبہ و استغفار میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ یعنی اس سے انبیاء کرام کے احساس فرض کا پہلو سامنے نظر آتا ہے' جبکہ کتاب پیدائش کی ایک بھی دعا ایسی نہیں ہے جس کو اس ضمن میں بطور حوالہ پیش کیا جا سکے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن حکیم چونکہ وہ واحد کتاب ہے جس کا متن ہر طرح کی کمی بیشی سے محفوظ ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود اس کے نازل کرنے والے نے اپنے اوپر لے رکھا ہے' لہٰذا قرآن حکیم میں انبیاء کرام علیہم السلام کی دعائیں خود ان کے اپنے الفاظ میں نقل ہوئی ہیں۔ جبکہ دوسری الہامی کتب میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تحریف ہوتی رہی ہے اور ان کے مرتب کرنے والوں نے انبیاء کرام علیہم السلام کی دعاؤں کو اپنی ذہنی سطح کے مطابق الفاظ کا لبادہ اوڑھایا ہے۔ بنابریں قرآن حکیم کی دعاؤں میں دعا کی حقیقت' اہمیت' افادیت سبھی کچھ نظر آتا ہے۔

قرآنی اسلوب دعا نے یہ تعلیم دی کہ مصائب کے وقت مایوس نہ ہو بلکہ رحمت باری تعالیٰ کے طلب گار بن جاؤ اور خدا کی بارگاہ میں جھک کر دعا مانگو۔ وہ ضرور آسانیاں پیدا فرمائے گا۔

﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ' اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيْعًا ' اِنَّهُ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○ ﴾

(الزمر : ۵۳)

"(اے پیغمبر میری طرف سے لوگوں سے) کہہ دو کہ اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم و زیادتی کی خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہوں' یقیناً اللہ سب کے گناہ بخش دیتا ہے اور وہ بخشنے والا مہربان ہے"۔

حواشی

{۱} خیراللہ خاں' قاموس الکتاب' ایم۔ آئی۔ کے لاہور' ۱۹۹۰ء ص ۴۰۲

{۲} کلام مقدس' سوسائٹی آف سینٹ پال روما' ۱۹۵۸ء

{۳} خیراللہ خاں' قاموس الکتاب' ص ۴۰۲

بقیہ : امام نووی رحمۃ اللہ علیہ

{۲۶} یافعی : مرءاۃ الجنان' ج ۴' ص ۱۸۶

{۲۷} ابن سبکی : طبقات الشافعیہ' ج ۵' ص ۱۶۷

{۲۸} یافعی : مرءاۃ الجنان' ج ۴' ص ۱۸۵

{۲۹} طاش کبریٰ زادہ : مفتاح السعادۃ' ج ۱' ص ۳۵۸

{۳۰} حاجی خلیفہ چلپی : کشف الظنون' ج ۱' ص ۵۴۴

{۳۱} حاجی خلیفہ چلپی : کشف الظنون' ج ۱' ص ۱۱۷

{۳۲} حاجی خلیفہ چلپی : کشف الظنون' ج ۱' ص ۸۷

{۳۳} حاجی خلیفہ چلپی : کشف الظنون' ج ۱' ص ۳۱۸

{۳۴} نووی : مقدمہ شرح مسلم' ص ۴

{۳۵} ابن کثیر : البدایہ والنہایہ' ج ۱۳' ص ۲۷۹

{۳۶} ابن عماد : شذرات الذہب' ج ۵' ص ۳۵۶

{۳۷} ضیاء الدین اصلاحی : تذکرۃ المحدثین' ج ۲' ص ۴۳۹ تا ۴۴۱

{۳۸} نووی : کتاب الاذکار' ص ۲۹

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال اور ڈاکٹر اسرار احمد
کے
تعلیمی نظریات کا موازنہ (۳)

ظفر اقبال محسن کا تحقیقی مقالہ

باب چہارم

تعلیمی نظریات کا موازنہ

تعلیمی نظریات میں مماثلت اور اختلافات کے اسباب

علامہ اقبال اور ڈاکٹر اسرار احمد کے تعلیمی نظریات میں مماثلت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دونوں کے نظریات اور تصورات قرآن حکیم سے اخذ کردہ ہیں۔ دونوں اپنی آراء کے سلسلے میں قرآن حکیم کو بنیاد و اساس بناتے ہیں۔ مماثلت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ دونوں مفکرین مسلمانوں کو من حیث القوم عروج اور ترقی کی راہ پر گامزن دیکھنا چاہتے ہیں۔ علاوہ ازیں دونوں مفکرین' دین کے معاملات میں' اجتہاد کے داعی ہیں۔ ایک اور اہم وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد کے فکر اور تصورات پر علامہ اقبال کے فکر کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔

دونوں مفکرین کے نظریات میں جو تھوڑا سا اختلاف ہے اس کا سبب بنیادی طور پر دونوں کے مختلف ادوار اور حالات ہیں۔ حضرت علامہ اقبال کا دور قیام پاکستان سے پہلے کا ہے۔ ظاہر ہے اُس وقت یہاں انگریزوں کی حکومت تھی اور حالات موجودہ دَور سے بہت مختلف تھے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے اگرچہ ایک نوجوان کے طور پر تحریک پاکستان میں

حصہ لیا' لیکن ان کا دور قیام پاکستان کے بعد کا دور ہے۔ ادوار کے اس اختلاف کی بنا پر تصورات و نظریات میں جزوی اختلافات منطقی و فطری امر ہے۔

اختلاف کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ علامہ اقبال بنیادی طور پر فلسفی اور شاعر تھے۔ انہوں نے اپنا پیغام فلسفے اور شاعری کے ذریعے لوگوں تک پہنچایا' جبکہ ڈاکٹر اسرار احمد نہ فلسفی ہیں نہ شاعر ـــــ بلکہ ان کا پیغام پہنچانے کا انداز خطیبانہ ہے اور آپ ایک عالم دین' مذہبی سکالر اور معلم و مدرس قرآن کے طور پر جانے جاتے ہیں۔

مماثل نظریات

علامہ اقبال اور ڈاکٹر اسرار احمد کے نظریات تعلیم میں سے مندرجہ ذیل میں مماثلت پائی جاتی ہے۔

تصورِ حقیقت' تصورِ کائنات' ذرائع علم' نصابِ علم' معلم مطلوب' متعلم مطلوب' تعلیم نسواں' مروجہ دنیوی نظام تعلیم پر تنقید' مروجہ دینی نظام تعلیم پر تنقید' مذہب اور سائنس۔

مختلف نظریات

تصورِ علم' اقسام علم اور مقاصد علم۔

نظریات کی مماثلت

اب ہم تمام موضوعات پر نظریات کی مماثلت بیان کریں گے۔

تصورِ حقیقت

دونوں مفکرین تصورِ حقیقت کے باب میں اللہ تعالیٰ کو حتمی سچائی (Final Truth) یا حقیقت اولیٰ (The Ultimate Reality) تصور کرتے ہیں۔ دونوں کے نزدیک صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ذات حقیقی ہے۔ ذات خدا کو علامہ اقبال "انائے لامتناہی" یا "انائے مطلق" سے تعبیر کرتے ہیں اور ڈاکٹر اسرار احمد اسے "انائے کبیر" کا نام

دیتے ہیں۔

تصورِ کائنات

علامہ اقبال اور ڈاکٹر اسرار احمد ـــــ دونوں مفکرین اس کائنات کی تخلیق کو اتفاقیہ یا کھیل تماشہ سمجھنے کی بجائے "امر ربی" سمجھتے ہیں اور دونوں کسی جامد و ساکت کائنات کے قائل نہیں بلکہ دونوں کے نظریات میں کائنات پیہم رواں دواں ہے۔ علاوہ ازیں دونوں اس کائنات اور اس کے رموز پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ علامہ اقبال کائنات کو فلسفیانہ انداز میں بیان کرتے ہیں جبکہ ڈاکٹر اسرار احمد قرآن اور احادیث کی روشنی میں کائنات کی حقیقت کو سامنے لاتے ہیں۔

ذرائع علم

دونوں مفکرین کے نزدیک علم کے ذرائع یہ ہیں۔

(۱) وحی (۲) حواس و ادراک (۳) وجدان

دونوں کے نزدیک اصل علم وہ ہے جو وحی کے ذریعے حاصل ہو۔ دونوں اسی علم کو حقیقت مطلقہ تک رسائی کا اصل ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ دونوں مفکرین حواس و ادراک کو علم کی محض ابتداء سمجھتے ہیں اور دونوں کی رائے ہے کہ وحی کے مقابلہ میں حواس و ادراک کے ذریعے حاصل ہونے والے علم میں غلطی ہو سکتی ہے۔ البتہ دونوں مفکرین کے ہاں اِن تینوں ذرائع علم کیلئے الفاظ اور ان کی تقسیم قدرے مختلف ہے۔

نصاب تعلیم

دونوں مفکرین اپنے تعلیمی نظریات میں نصابِ تعلیم کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ دونوں دینی و دنیوی یا مذہبی و سائنسی علوم میں ہم آہنگی اور یکسانیت (Unification) کے قائل ہیں۔ دونوں مفکرین کی رائے ہے کہ قرآن و حدیث کو نصاب میں بنیادی اہمیت دی جانی چاہئے اور تمام علوم اس کے تابع ہونے چاہئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تسخیر کائنات سے متعلقہ سائنس و ٹیکنالوجی کے علوم کی تعلیم بھی اشد ضروری ہے۔ دونوں

مفکرین نے ان علوم کو انسانیت کی بہتری کے لئے استعمال کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

معلّم مطلوب

علامہ اقبال کے تعلیمی نظریات کے مطابق استاد کو خود شناس' جمالی و جلالی' حقیقت پسند' متحرک' حامل بصیرت اور متوازن شخصیت کا حامل ہونا چاہئے۔ جبکہ ڈاکٹر اسرار احمد کی رائے میں استاد کو طلبہ کے لئے قابل تقلید نمونہ' وسیع المطالعہ' ماہر فن' محنتی' ماہر نفسیات اور باعمل ہونا چاہئے۔ ان اصطلاحات پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ معلم مطلوب کے بارے میں دونوں کی آراء میں معنوی یکسانیت پائی جاتی ہے۔

متعلّم مطلوب

علامہ اقبال طالب علم کو شاہین صفت' صاحب کتاب' شائق علم' باذوق' باکردار اور پیکر محبت دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ آپ طلبہ کے الحاد پرستانہ اور مذہب بیزار رویے کے خلاف ہیں اس کے مقابلہ میں آپ چاہتے ہیں کہ ان کی خودی بیدار ہو اور ان میں ایسی صفات پیدا ہوں کہ وہ ستاروں پر کمند ڈالنے کے قابل بن جائیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد بھی طالب علم کو شائق علم' مؤدب و تابع فرمان' مستقل مزاج' سادہ' پرعزم اور باعمل دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کے نزدیک خندہ پیشانی اور بلند حوصلگی ایک اچھے طالب علم کا خاص وصف ہیں۔ معنویت کے لحاظ سے ایک مثالی طالب علم کے سلسلہ میں بھی علامہ اقبال اور ڈاکٹر اسرار احمد کے تعلیمی نظریات ملتے جلتے ہیں۔

تعلیم نسواں

علامہ اقبال اور ڈاکٹر اسرار احمد دونوں معاشرے میں عورت کے بلند مقام کو تسلیم کرتے ہیں۔ دونوں کے تعلیمی نظریات میں یہ امر واضح طور پر مشترک ہے کہ عورت کو تعلیم دینا بے حد ضروری ہے۔

دونوں مفکرین کی آراء میں اس بات پر بھی اتفاق پایا جاتا ہے کہ عورتوں کے لئے

نصابِ تعلیم مَردوں کے نصاب سے مختلف ہونا چاہئے' اور عورتوں کو ایسے مضامین پڑھائے جانے چاہئیں جن کے ذریعے وہ اپنے گھریلو اور خانگی مسائل سے بہتر طریقے سے نپٹ سکیں اور آنے والی نسلوں کی صحیح پرورش اور تعلیم و تربیت کا حق ادا کر سکیں۔ دونوں مفکرین مخلوط طریقہ تعلیم کے مخالف ہیں۔

مروّجہ دنیوی نظام تعلیم پر تنقید

مروجہ دنیوی نظام تعلیم کے متعلق بھی دونوں مفکرین کی آراء تقریباً ایک جیسی ہیں' دونوں جدید تعلیم کو اہم اور ضروری خیال کرتے ہیں' لیکن دونوں مفکرین کی رائے ہے کہ اس تعلیم کو قرآنی تعلیمات کے تابع رہنا چاہئے۔ محض مغربی اور الحاد پرستانہ تعلیم کو دونوں نقصان دہ اور خطرناک سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس نظام تعلیم سے حاصل ہونے والا علم انسان کو حتمی سچائی اور اس کی اصل منزل تک نہیں پہنچا سکتا۔ اس نظام تعلیم سے مادیت پرستی اور الحاد پرستانہ نظریات سامنے آ رہے ہیں اور دلوں میں سرایت کرتے جا رہے ہیں جو کہ مسلمانوں کے لئے بہت نقصان دہ بات ہے۔

مروّجہ دینی نظام تعلیم پر تنقید

مروجہ دنیوی نظام تعلیم کی طرح دونوں مفکرین دینی مدارس کے مروجہ نظام تعلیم سے بھی غیر مطمئن اور نالاں ہیں۔ علامہ ڈاکٹر اقبال اور ڈاکٹر اسرار احمد کے نزدیک دینی مدارس کا نظام تعلیم بہت پرانا اور فرسودہ ہو چکا ہے' ان کا طریقہ تدریس اور نظام ہماری موجودہ ضروریات سے مطابقت نہیں رکھتا' اس لئے وہ دورِ جدید کے تقاضوں اور عصر حاضر کے مسائل کے حل میں ناکام ہے۔

دونوں مفکرین کی آراء میں اس لحاظ سے بھی مماثلت پائی جاتی ہے کہ دونوں دنیوی اور دینی تعلیم کے درمیان حائل خلیج کو ختم کرنے اور دونوں علوم کو یکجا کرنے کے قائل ہیں۔ دونوں کے نزدیک دنیوی اور دینی نظام ہائے تعلیم کی خامیوں کو دُور کرنے کا واحد طریقہ بھی یہی ہے کہ ان دونوں کو اکٹھا کر دیا جائے۔

مذہب اور سائنس

مذہب اور سائنس کے متعلق بھی ڈاکٹر علامہ محمد اقبال اور ڈاکٹر اسرار احمد کے تعلیمی نظریات میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں کے خیال میں مذہب اور سائنس میں نہ تو کوئی تضاد ہے اور نہ ہی یہ ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ دونوں مفکرین کی رائے ہے کہ اصل حقائق قرآن حکیم میں بیان کئے گئے ہیں' سائنس انہی حقائق کو منظر عام پر لا رہی ہے۔ دونوں مفکرین کے نزدیک سائنسی علوم کا حصول مسلمانوں کی تعلیم کا لازمی حصہ ہونا چاہئے۔

نظریات کا اختلاف

علامہ اقبال اور ڈاکٹر اسرار احمد کے تعلیمی نظریات میں مندرجہ ذیل موضوعات پر اختلاف پایا جاتا ہے۔

تصورِ علم

علامہ اقبال کے ہاں علم درحقیقت شعور کے ہی ایک مرتب اور منظم بیان کا نام ہے۔ وہ علم کو انسان کی نوعیت تصوری سے تعبیر کرتے ہیں۔ آپ کے نزدیک علم باطن شکن ہے اور باقاعدہ نظام کے تحت وجود میں آتا ہے۔ علامہ مرحوم کے خیال میں علم حق نما' حرکت پذیر اور متنوع ہوتا ہے۔

جبکہ ڈاکٹر اسرار احمد کی رائے میں علم دراصل انہی چیزوں میں سے ایک ہے جن کی حقیقت تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ آپ کے نزدیک علوم کی درجہ بندی تو کی جا سکتی ہے' انہیں مختلف شاخوں میں تقسیم تو کیا جا سکتا ہے' لیکن خود علم کی ماہیت کیا ہے؟ یہ جاننا بہت مشکل ہے۔

اقسامِ علم

علامہ اقبال کے نزدیک علم کی اقسام یہ ہیں۔ فلسفیانہ علوم' ادبی و فنی علوم' تجربی علوم' سائنسی علوم' مذہبی علوم' سماجی علوم' معاشرتی علوم اور روحانی علوم۔

جبکہ ڈاکٹر اسرار احمد نے علم کی صرف دو بڑی اقسام بیان کی ہیں۔ آپ کی رائے میں علم دو طرح کے ہیں 'علم الابدان اور علم الادیان۔

مقاصدِ علم

شاعر مشرق کے تعلیمی نظریات میں مقاصد علم کے باب میں مختلف مصنفین کی آراء مختلف ہیں۔ بہرحال علامہ اقبال نے انفرادی اور اجتماعی خودی کے حوالے سے تعلیم کے مقاصد کا تعین کیا ہے۔ وہ خودی کی تربیت کے ذریعے ہی مقاصد تعلیم کا حصول ممکن سمجھتے ہیں۔ وہ تعلیم کے ذریعے فرد اور قوم کی خودی کی تربیت کرنا چاہتے ہیں۔ جبکہ ڈاکٹر اسرار احمد کے ہاں تعلیم کے دو اہم مقاصد ہیں اور وہ ہیں عبودیت الٰہی اور قیادت عالم۔

☆ ☆ ☆

باب پنجم

خلاصہ 'حاصلات 'سفارشات

خلاصہ

موجودہ دَور میں نظریات 'فلسفہ و فکر اور علوم و فنون کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے شعبہ ہائے زندگی کی طرح تعلیم کے میدان میں بھی مختلف نظریات ہیں۔ یہ نظریات پورے نظام تعلیم کو متاثر کرتے ہیں۔ پاکستان کی بنیاد چونکہ نظریہ اسلام پر ہے اس لئے پاکستان کے نظام تعلیم میں اسلامی تعلیمات و نظریات اور مسلم مفکرین کے تعلیمی نظریات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی اہمیت کے پیش نظر ڈاکٹر علامہ محمد اقبال اور ڈاکٹر اسرار احمد کے تعلیمی نظریات کو تحقیق کا موضوع بنایا گیا ہے۔

اس تحقیق کے مقاصد یہ تھے کہ علامہ اقبال اور ڈاکٹر اسرار احمد کے تعلیمی نظریات کا موازنہ کر کے 'ان دونوں مفکرین کے فلسفہ و فکر کی روشنی میں پاکستان کے نظام تعلیم کی اصلاح کے لئے تجاویز دی جائیں۔ موضوع اور مواد کی وسعت اور وقت کی کمی کے سبب ڈاکٹر علامہ محمد اقبال اور ڈاکٹر اسرار احمد کے تعلیمی نظریات میں سے چند منتخب عنوانات کو

زیر مطالعہ لایا گیا۔

اسلوب تحقیق بیانیہ تھا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر علامہ محمد اقبال اور ڈاکٹر اسرار احمد کی کتب کے علاوہ دوسرے مصنفین کی کتابوں سے بھی مواد حاصل کیا گیا۔

پہلے علامہ محمد اقبال کے تعلیمی نظریات پیش کئے گئے۔ ان نظریات میں تصورِ حقیقت' تصورِ کائنات' تصورِ علم' ذرائع علم' اقسام علم' مقاصد علم' نصاب تعلیم' معلم مطلوب' متعلّم مطلوب' تعلیم نسواں' مروجہ دنیوی نظام تعلیم پر تنقید' مروجہ دینی نظام تعلیم پر تنقید اور مذہب و سائنس جیسے موضوعات کو زیر مطالعہ لایا گیا۔

تیسرے باب میں انہی موضوعات سے متعلقہ ڈاکٹر اسرار احمد کے تعلیمی نظریات پیش کئے گئے۔ چوتھے باب میں دونوں مفکرین کے تعلیمی نظریات کا موازنہ کیا گیا۔

تصورِ حقیقت' تصورِ کائنات' ذرائع علم' نصابِ علم' معلم مطلوب' متعلّم مطلوب' تعلیم نسواں' مروجہ دنیوی نظام تعلیم پر تنقید' مروجہ دینی نظام تعلیم پر تنقید اور مذہب و سائنس۔ ان جیسے موضوعات پر دونوں مفکرین کے نظریات میں مماثلت پائی جاتی ہے جبکہ تصورِ علم' اقسام علم اور مقاصد علم کے ضمن میں دونوں مفکرین کے تعلیمی نظریات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

نظریات میں مماثلت کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کے نظریات بنیادی طور پر قرآن و حدیث سے اخذ کردہ ہیں اور دونوں دین کے معاملات میں اجتہاد کے احیاء کے داعی ہیں۔ اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ دونوں مفکرین کے ادوار مختلف ہیں۔ ان مختلف ادوار میں حالات' واقعات اور ضروریات فطری طور پر مختلف ہیں۔ یوں نظریات میں تھوڑا بہت اختلاف منطقی اور فطری عمل ہے۔

حاصلات

اس تحقیق کے نتیجہ میں مندرجہ ذیل حاصلات سامنے آئے۔

۱۔ علامہ محمد اقبال اور ڈاکٹر اسرار احمد دونوں معروف معانی میں ماہرین تعلیم نہیں ہیں اور دونوں نے معروف مفکرین تعلیم کی طرح فن تعلیم و تدریس پر کوئی کتاب بھی

نہیں لکھی' لیکن پھر بھی تعلیمی میدان میں دونوں مفکرین کے نظریات بڑے واضح اور نمایاں ہیں۔

۲۔ تصورِ حقیقت کے باب میں دونوں مفکرین متفق ہیں کہ اصل حقیقت صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ باقی جو کچھ ہے محض خیالی اور اعتباری ہے۔

۳۔ تصورِ کائنات کے ضمن میں بھی دونوں مفکرین کی متفقہ رائے یہ ہے کہ یہ کائنات عبث اور فضول نہیں ہے اور نہ ہی کسی حادثے اور اتفاق کا نتیجہ ہے۔ بلکہ یہ کائنات بامقصد اور متحرک ہے اور اس میں اس کے پروردگار کی نشانیاں پنہاں ہیں۔

۴۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے نزدیک علم باطن شکن' حق نما' حرکت پذیر اور متنوع ہے جبکہ ڈاکٹر اسرار احمد کی رائے میں علم کی حقیقت کو سمجھنا بہت ہی مشکل ہے۔

۵۔ وحی الٰہی' حواس وادراک اور صوفیانہ واردات' تینوں علم کے ذرائع ہیں لیکن ان میں سے مستند ترین اور اصل ذریعہ وحی الٰہی ہے۔

۶۔ بنیادی طور پر علوم دو طرح کے ہیں' علم الادیان اور علم الابدان۔

۷۔ دونوں مفکرین کے نزدیک دینی و دنیوی' دونوں طرح کے علوم کو نصاب کا حصہ ہونا چاہئے' البتہ دنیوی علوم کو دینی تعلیمات کے ماتحت رکھنا ضروری ہے۔

۸۔ مسلمان مفکرین استاد میں حقیقت پسندانہ رویہ' شفقت' خود شناسی' طلبہ سے محبت' پیشہ معلمی پر فخر اور سنجیدگی و متانت دیکھنا چاہتے ہیں۔

۹۔ اسلامی طرز تعلیم میں شاگرد کو مؤدب' شائق علم' باعمل اور شاہین صفت ہونا چاہئے۔

۱۰۔ عورتوں کو جدید مغربی تعلیم دینا ہمارے ثقافتی ورثے اور روایات کے منافی ہے۔ علاوہ ازیں مخلوط تعلیم ہمارے لئے بہت خطرناک ہے۔

۱۱۔ سائنس اور مذہب میں کوئی تصادم اور تضاد نہیں ہے۔

۱۲۔ موجودہ دینی اور دنیوی نظام تعلیم' دونوں ناقص ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دونوں نظاموں کو یکجا کر کے Unification of Knowledge پیدا کی جائے اور ان دونوں نظاموں کے درمیان خلیج کو ختم کیا جائے۔

سفارشات

اس تحقیق کی روشنی میں مندرجہ ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ دینی اور دنیوی تعلیم کی تقسیم اور خلیج کو ختم کر کے انہیں یکجا کیا جائے۔

۲۔ قطعی اور حتمی ذریعہ علم یعنی قرآن حکیم کی تعلیم کو عام کیا جائے۔

۳۔ زندگی کے ہر شعبے میں اجتہاد کو زندہ کیا جائے اور اس کے ذریعے دور حاضر کے مسائل کا حل تلاش کیا جائے۔

۴۔ مخلوط تعلیم ہماری روایات اور تہذیب و ثقافت کے منافی ہے' اسے ختم کیا جائے۔

۵۔ سائنسی اور فنی تعلیم کو عام کیا جائے اور طلبہ میں حرکت و عمل کے جذبات پیدا کئے جائیں۔

۶۔ پاکستان کے نظام تعلیم کو اسلامی تعلیمات اور مسلم مفکرین کے نظریات کے مطابق ڈھالا جائے۔

☆ ☆ ☆

کتابیات

۱۔ القرآن الحکیم۔

۲۔ ادارہ مصنفین پاکستان : "اقبال کا نظریہ تعلیم" گلوب پبلشرز' اردو بازار لاہور' طبع اول۔ ۱۹۸۴ء۔

۳۔ بختیار حسین صدیقی : "اقبال بحیثیت مفکر تعلیم" اقبال اکیڈمی پاکستان لاہور' ۱۹۸۳ء۔

۴۔ بزم اقبال : "فلسفہ اقبال" بزم اقبال' نرسنگھ داس گارڈن لاہور۔

۵۔ ڈاکٹر اسرار احمد : "اسلام کی نشاۃ ثانیہ' کرنے کا اصل کام" مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' طبع ہشتم۔ ۱۹۹۳ء۔

۶۔ ڈاکٹر اسرار احمد : "اسلام میں عورت کا مقام" مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' طبع پنجم۔ ۱۹۹۲ء۔

۷۔ ڈاکٹر اسرار احمد : "حساب کم و بیش" مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' طبع اول ۱۹۹۴ء

۸۔ ڈاکٹر اسرار احمد : "زندگی' موت اور انسان" مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' فروری۔ ۱۹۸۸ء۔

۹۔ ڈاکٹر اسرار احمد : "علامہ اقبال اور ہم" مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' طبع پنجم ۱۹۹۵ء۔

۱۰۔ ڈاکٹر اسرار احمد : "عزم تنظیم" تنظیم اسلامی پاکستان' لاہور' طبع دوم ۱۹۹۲ء۔

۱۱۔ شیخ جمیل الرحمٰن : "قافلۂ تنظیم منزل بہ منزل" : ماہنامہ "میثاق" اپریل ۱۹۸۸ء' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور۔

۱۲۔ عبدالواحد معینی : "مقالات اقبال" اشرف پریس لاہور' ۱۹۶۳ء۔

۱۳۔ عبدالحکیم خلیفہ : "فکر اقبال" بزم اقبال نرسنگھ داس گارڈن لاہور' طبع پنجم ۱۹۸۳ء۔

۱۴۔ غلام السیدین' خواجہ : "اقبال از ایجوکیشنل فلاسفی" لاہور۔

۱۵۔ محمد اقبال : "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" ترجمہ سید نذیر نیازی' بزم اقبال لاہور' ۱۹۸۵ء۔

۱۶۔ محمد اقبال : "کلیات اقبال" الفیصل ناشران و تاجران کتب' لاہور' ۱۹۹۵ء۔

۱۷۔ محمد احمد صدیقی : "اقبال کے تعلیمی نظریات" اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کراچی' ۱۹۶۵ء۔

۱۸۔ محمد احمد خاں : "اقبال اور مسئلہ تعلیم" اقبال اکادمی پاکستان لاہور' ۱۹۷۸ء۔

۱۹۔ محمد حامد : "افکار اقبال" اقبال اکادمی پاکستان لاہور' طبع اول ۱۹۸۶ء۔

۲۰۔ محمد جاوید نقشبندی : "علامہ ڈاکٹر محمد اقبال اور علامہ ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے تعلیمی نظریات کا موازنہ" ادارہ منہاج القرآن لاہور' ۱۹۹۲ء۔

۲۱۔ محمد فاروق جوش : "اقبال اور تعلیم" شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ' ۱۹۸۳ء۔

۲۲۔ نیاز فتح پوری : "اقبال کا فلسفہ خودی' فکر و نظر" علی گڑھ مسلم یونیورسٹی' ۱۹۵۷ء۔

بقیہ : لغات و اعراب قرآن

عبارت (بصورت آیت یا قطعۂ آیات) اور ترجمہ الگ الگ ایک دوسرے کے بالمقابل یا اوپر نیچے---- مگر بین السطور نہیں---- لکھے جائیں' جیسا کہ اکثر انگریزی تراجم میں اور بعض تفاسیر میں کیا گیا ہے۔ جہاں تک اصل ترجمہ کی صحت' انتخابِ الفاظ کی موزونیت اور اصل (عربی عبارت) کی نحوی ترکیب کی رعایت کا تعلق ہے تو اِس کو جانچنا تو عربی دانی کا محتاج ہے۔

(جاری ہے)

سُوْرَةُ الْبَقَرَة

آیت ۱۰۹ - ۱۱۰

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کیلئے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغہ 'الاعراب' الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی علی الترتیب اللغہ کیلئے ۱' الاعراب کیلئے ۲' الرسم کیلئے ۳' اور الضبط کیلئے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغہ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لئے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لئے نمبر کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲:۵:۱(۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغہ کا تیسرا لفظ اور ۲:۵:۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲ : ۶۶

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

۲ : ۶۶ : ۱ اللُّغة

۲ : ۶۶ : ۱(۱) [وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ]

① "وَدَّ" کا مادہ "ودد" اور وزن (اصلی) "فعل" ہے۔ اس سے فعل مجرد باب سمع اور فتح دونوں سے آتا ہے۔ یعنی وَدَّ.... یَوَدُّ وَدًّا وَ مَوَدَّۃً۔ ماضی مضارع دراصل وَدَدَ یَوْدَدُ تھے' پھر مضاعف کے قاعدے کے مطابق صیغہ ماضی میں مثل اول متحرک کو ساکن کر کے مثل ثانی میں مدغم کر دیا جاتا ہے یعنی وَدَدَ = وَدْدَ= وَدَّ.... اور صیغہ مضارع میں متحرک مثل اول کی حرکت ماقبل ساکن حرف علت "و" کو منتقل ہو جاتی ہے اور اب ساکن مثل اول مثل ثانی میں مدغم ہو جاتا ہے یعنی یَوْدَدُ = یَوْدْدُ = یَوَدُّ۔ اس فعل میں بنیادی معنی ".... سے محبت کرنا'.. .. کو دل سے چاہنا'.... کو دوست رکھنا" ہیں اور پھر اس میں ".... کی تمنا کرنا۔ آرزو کرنا اور.. . کی خواہش کرنا" کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔

اِس فعل کا مفعول بنفسہ بھی آتا ہے۔ لیکن زیادہ تر اِس کا مفعول حرف تمنا "لَوْ" (کاش کہ) یا "اَنْ" (کہ) سے شروع ہونے والے جملے کی صورت میں آتا ہے۔ قرآن کریم میں اِس فعل مجرد سے مختلف صیغے ۱۶ جگہ آئے ہیں جن میں سے صرف ایک جگہ (آل عمران : ۱۱۸) یہ مفعول بنفسہ کے ساتھ آیا ہے۔ تین جگہ "اَنْ" کے ساتھ باقی سب جگہ "لَوْ" کے ساتھ آیا ہے اور بعض دفعہ دونوں معنی کو اُردو میں صرف "چاہنا" یا "دل سے چاہنا" کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں۔ اِس فعل مجرد کے متعدد مصادر آئے ہیں' ان میں سے دو (وَدٌّ (بضم الواو) اور "مَوَدَّۃٌ" قرآن کریم میں آئے ہیں۔ نیز مزید فیہ کے باب مفاعلہ سے ایک صیغہ فعل کے علاوہ اِس مادہ سے متعدد ماخوذ و مشتق اسم (وَدُوْد' وَدٌّ اور مَوَدَّۃ وغیرہ) بھی قرآن میں وارد ہوئے ہیں۔ نیز دیکھئے البقرہ : ۹۶ [۲ : ۵۹ : ۱ (۳)] زیر مطالعہ فعل "وَدَّ" صیغہ ماضی ہے مگر بیان واقعہ اور سیاق عبارت کے لحاظ سے اکثر مترجمین نے اِس کا ترجمہ بزمانہ حال "دوست رکھتے/چاہتے/دل سے چاہتے/یہ چاہتے ہیں" کی صورت میں کیا ہے۔ ایک آدھ نے "چاہا" (بصورت ماضی) بھی ترجمہ (لفظی) کیا ہے اور بعض نے "وَدَّ" کا فاعل "اہل کتاب" (جن کا ذکر آگے آ رہا ہے) کی بجائے ان کے "دل" کو ہی بتا کر بامحاورہ بصورت ".... کا دل چاہتا ہے" سے کیا ہے' جس میں "تمنا" والا مفہوم موجود ہے۔

② "کَثِیْرٌ" (بہت سے/بہت/بہتیرے)۔ جو "ک ث ر" سے فعیل کے وزن پر اسم مبالغہ ہے — اُردو میں مستعمل ہے۔ اِس کے متعلق مفصل بحث البقرہ : ۲۶ [۲ : ۱۹ : ۱ (۱۰)] میں ہوئی تھی۔

۳ "مِنْ" (میں سے) بہت دفعہ گزرا ہے۔ نیز دیکھئے البقرہ :۳ [۲:۲:۱(۵)]

۴ "اَھْلِ الْکِتٰبِ" (کتاب والے / کتابی / اہلِ کتاب) اِس ترکیب اضافی میں "کتاب" تو معروف لفظ ہے۔ دیکھئے البقرہ :۲ [۲:۱:۱(۲)] اور "اَھْل"---- جس کا مادہ "ا ھ ل" اور وزن فَعْلٌ ہے فعل مجرد "اَھَلَ یَاْھَلُ" (نصر سے) کے معنی "آباد ہونا" ہیں اور جو زیادہ تر مجہول استعمال ہوتا ہے' مثلاً "اُھِلَ الْمَکَانُ" (جگہ آباد کی گئی / ہوگئی۔ اِس میں رہنے والے آگئے)---- تاہم اِس مادہ سے کسی قسم کا کوئی صیغۂ فعل قرآنِ کریم میں کہیں نہیں آیا۔ بلکہ صرف یہی لفظ (اَھْل) مرکب صورتوں میں ۱۲۱ مقامات پر آیا ہے اور اِس کی جمع سالم "اَھْلُوْنَ" مختلف حالتوں (رفع' نصب' جر) میں مضاف ہو کر بصورتِ "اَھْلُوْ..../ اَھْلِی....." چھ دفعہ آئی ہے' بلکہ یہ لفظ "اَھْل" واحد ہو یا جمع ہمیشہ مضاف ہو کر ہی استعمال ہوتا ہے۔ اِس کی جمع مکسر "اَھَالٍ" (بروزن لَیَالٍ = راتیں) بھی آتی ہے۔ تاہم یہ جمع (مکسر) قرآنِ کریم میں نہیں آئی اور یہی جمع اُردو میں بصورتِ "اَھالی" استعمال ہوتی ہے' جو دراصل عربی ہی ہے۔

● لفظ "اَھل" کا اُردو ترجمہ موقع استعمال کی مناسبت سے "گھر والے۔ افرادِ کنبہ۔ قریبی رشتہ دار۔ بیوی بچے۔ پیروکار۔ حقدار۔ مالک۔ مستحق۔ سزاوار۔ باشندے" کی صورت میں اور بعض دفعہ "مضاف' اصحاب اور اُولُو" کی طرح) "والے" کے ساتھ ترجمہ کرتے ہیں مثلاً اھل القریٰ (بستیوں والے)' اھل البیتِ (گھر والے)' اھل النّارِ (دوزخ والے) وغیرہ اور جمع کے مفہوم کے باوجود یہ لفظ عموماً بصورتِ واحد ہی استعمال ہوتا ہے۔ صرف ایک جگہ (المدّثر :۵۶) یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے "سزاوار' لائق" اور "والا" (واحد) کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ یعنی "اَھْلُ التَّقْوٰی وَاَھْلُ الْمَغْفِرَۃِ" (ڈرنے کے لائق اور بخشش والا)۔

● "اھل الکتاب" کا ترجمہ تو "کتاب والے" ہے۔ عموماً اِس سے مُراد مسیحی اور یہودی لئے جاتے ہیں۔ اور زیرِ مطالعہ آیت میں بھی یہ ترکیب اسی مفہوم کے ساتھ آئی ہے---- اِس حصۂ آیت (وَدَّ کَثِیْرٌ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ) کا ترجمہ لفظی بنتا ہے "دل سے چاہا بہتیروں نے کتاب والوں میں سے" جس کی ایک بامحاورہ صورت "دل چاہتا ہے بہت سے اہل کتاب / کتاب والوں / کتابیوں کا" بھی ہے' تاہم اکثر مترجمین نے "اہل کتاب" کی اُردو میں رائج (فارسی) ترکیب کو ہی استعمال کیا ہے اور اُردو محاورے کے مطابق فعل (وَدَّ) کا ترجمہ بھی آخر پر لائے ہیں' یعنی بہت سے اہل کتاب / اکثر اہل کتاب / اہل کتاب سے بہت سے لوگ / اہل کتاب میں سے بہتیرے چاہتے ہیں / دل سے تو یہ چاہتے ہیں / دل ہی سے چاہتے ہیں" کی

صورت میں۔

۲ : ۶۶ : ۱(۲) [لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا]

❶ "لَوْ" (کاش / کہ / کسی طرح)۔ گرائمر والے اسے حرفِ تقدیر بھی کہتے ہیں کیونکہ عموماً اِس کے ذریعے کوئی اندازہ بیان کیا جاتا ہے۔ یہاں یہ "تمنا" کے مفہوم میں آیا ہے۔ مزید دیکھئے [۲:۱۵:۱(۷)]

❷ "يَرُدُّوْنَكُمْ" (پھیر دیں / پھیر کر / پھر سے بنا دیں / بنا لیں وہ تم کو.....) اِس میں آخری ضمیر منصوب (كُمْ) بمعنی "تم کو / تمہیں" ہے اور اِس سے پہلے صیغۂ فعل (مضارع) "يَرُدُّوْنَ" کا مادہ "ردد" اور وزن اصلی "يَفْعُلُوْنَ" ہے' جو دراصل "يَرْدُدُوْنَ" تھا' پھر مثل اوّل کی حرکت اِس سے ماقبل ساکن (ر) کو دے کر مثلین کو مدغم کر دیا گیا' یعنی يَرْدُدُوْنَ ۔ يَرُدُّوْنَ ۔ يَرُدُّوْنَ ۔

● اِس مادہ سے فعل مجرد "رَدَّ يَرُدُّ" (دراصل رَدَدَ ۔ يَرْدُدُ) رَدًّا وَمَرَدًّا (بابِ نصر سے) کے بنیادی معنی "پھیر دینا' واپس لانا" ہیں۔ اِس فعل کے استعمالات اور معانی پر البقرہ :۸۵ [۲:۵۲: ۱(۸)] میں بات ہوئی تھی۔ یہاں اِس کے جو مختلف لفظی یا بامحاورہ تراجم کیے گئے ہیں وہ اوپر لکھ دیئے گئے ہیں۔ سب کا مفہوم ایک ہی ہے۔

❸ "مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ" (تمہارے ایمان / لائے / لاچکنے / لے آنے / مسلمان ہوئے / ہونے / (کے) پیچھے / کے بعد)۔ اِس پوری ترکیب جاری پر تو آگے "الاعراب" میں مزید بات ہوگی۔ مرکب کے ابتدائی حصّہ (مِنْ بَعْدِ) کے استعمال اور معنی پر البقرہ :۵۱ [۲:۳۳:۱(۷)] میں بحث ہو چکی ہے۔ اور "..... اِيْمَانِكُمْ" کی آخری ضمیر مجرور (كُمْ) تو بمعنی "تمہارا / تمہارے" ہے۔ اور لفظ "اِيْمَان" (بمعنی "ایمان لے آنا") پر (جو بابِ افعال کا مصدر ہے) البقرہ :۳ [۲:۲:۱(۱)] میں بات ہو چکی ہے۔ "ایمان لے آنا" کی بجائے "مسلمان ہونا" کا ترجمہ بلحاظ مفہوم (زیرِ مطالعہ عبارت کی حد تک تو) درست ہے۔ تاہم "ایمان" اور "اسلام" کے باہمی تعلق اور دقیق فرق کے بارے میں ذہن میں واضح تصور ہونا چاہئے جو قرآنِ کریم کی مختلف آیات میں موجود ہے اور محتاج مطالعہ ہے۔

❹ "كُفَّارًا" (کافر) اِس لفظ کی (یہاں) نصب پر تو آگے "الاعراب" میں بات ہوگی۔ لغوی اعتبار سے یہ لفظ (كُفَّار) اسم الفاعل (كَافِر) کی ایک جمع مکسر ہے جو قرآنِ کریم میں کم و بیش بیس جگہ آئی ہے (ایک اور جمع مکسر "الكَفَرَة" بھی ایک جگہ آئی ہے) ورنہ زیادہ تر تو قرآنِ

کریم میں اِس لفظ کی جمع مذکر سالم "الکَافِرُون۔ الکَافِرِین) ہی استعمال ہوئی ہے۔ اِس لفظ کے مادہ (ك ف ر) سے فعل مجرد کے باب معنی وغیرہ پر پہلی دفعہ البقرہ :۶ [۲: ۵: ۱ (۱)] میں مفصل بات ہوئی تھی۔ یہ الفاظ (کَافِر۔ کُفَّار) اردو میں اتنے متعارف ہیں کہ ترجمہ کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ اردو میں لفظ "کَافِر" بطور جمع بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے "کافر بھاگ گئے" میں۔ اسی لئے اکثر مترجمین نے "کُفَّار" کا ترجمہ "کافر" ہی کر دیا ہے۔ ایک آدھ نے سابقہ عبارت (پھیردیں) کی مناسبت سے اِس لفظ کا ترجمہ "کفر کی طرف" کیا ہے جو بلحاظ مفہوم ہی درست قرار دیا جا سکتا ہے۔

● الفاظ اور تراکیب کے الگ الگ لفظی اور بامحاورہ ترجموں کی مدد سے (جو اُوپر دیئے گئے ہیں) اب آپ مندرجہ بالا دونوں حصہ عبارت (وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا) کا ترجمہ مختلف انداز (مگر یکساں مفہوم) میں کر سکتے ہیں۔ تاہم ابھی یہ عبارت آگے چلتی ہے اور پورا ترجمہ اختتام آیت کے بعد ہی ممکن ہوگا۔

۲ : ۶۶ : ۱(۳) [------حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ...]

❶ "حَسَدًا" (حسد / جلن / سے / کی وجہ سے / رکھ کر / کے سبب / کی راہ سے) اِس لفظ کی (یہاں) نصب پر تو "الاعراب" میں بات ہوگی۔ اِس کا مادہ (جیسا کہ ظاہر ہے) "ح س د" اور وزن "فَعَلٌ" ہے جو یہاں منصوب آیا ہے۔ اِس مادہ سے فعل مجرد حَسَدَ ..... يَحْسُدُ حَسَدًا (نصر سے) آتا ہے اور اِس کا عام اردو ترجمہ "..... سے حسد کرنا" کر سکتے ہیں۔ کیونکہ لفظ "حَسَد" (جو اِس فعل مجرد کا مصدر ہے) اردو میں رائج اور مستعمل ہے۔ عربی میں اِس لفظ (اور اِس کے فعل) کا مطلب ہے "کسی مستحق شخص کی کسی خداداد نعمت کو خود چھین لینے یا کم از کم اِس شخص سے چھن جانے کی خواہش اور تمنا رکھنا۔" اور اِس مقصد کے لئے ہر طرح کی تدبیر کرنا بھی اِس کے مفہوم میں شامل ہے۔ جس شخص سے حسد کیا جائے اور جس چیز (نعمت) کی وجہ سے حسد کیا جائے وہ دونوں مفعول بنفسہ (منصوب) بھی آتے ہیں اور دوسرے مفعول (وجہ حسد چیز) پر "عَلٰی" بھی لگتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں: "حَسَدَهُ الشَّيْءَ وَ حَسَدَهُ عَلَى الشَّيْءِ" (اس نے اِس سے چیز کا / کی وجہ سے / حسد کیا)۔ بعض دفعہ دوسرا مفعول (وجہ حسد) محذوف یا غیر مذکور ہوتا ہے اور بعض دفعہ دونوں مفعول محذوف ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں اِس فعل سے تین صیغے (تین جگہ) آئے ہیں اور تینوں طرح استعمال ہوتے ہیں [یعنی دونوں مفعول کے حذف کے ساتھ' صرف دوسرے مفعول کے حذف کے ساتھ اور دوسرے مفعول پر

"عَلٰی" کے ساتھ] بعض مترجمین نے اِس کا ترجمہ "جلن" یا "دلی جلن" کی صورت میں کیا ہے' جو حسد کی خاصیت یا حاسد کی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔

❷ "مِنْ عِنْدِ....." (کے پاس سے / .... کی ہی جانب سے / ..... کی طرف سے) "عِنْدَ" (ظرف منصوب) کی اصل' اِس کے معنی و استعمال اور اِس پر "مِنْ" (الجارۃ) کے استعمال پر البقرہ :۵۴ [۲: ۳۴: ۱(۸)] میں مفصل بات ہو چکی ہے۔

❸ "..... اَنْفُسِهِمْ" (..... ان کی جانوں کے / ..... اپنے اندر کے / ..... ان کے دلوں ہی..../ اپنے ہی دلی.....) عربی کے کسی بھی مرکب جاری یا اضافی کی طرح اِس پوری ترکیب (مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ) کے اردو ترجمہ میں پہلے "اَنْفُسِهِمْ" اور پھر "مِنْ عِنْدِ....." کا ترجمہ کرنا پڑتا ہے اسی لئے اِس کا بالکل لفظی ترجمہ "جانوں اپنی کے پاس سے" کیا گیا ہے جسے بامحاورہ کرنے کے لئے "اپنے اندر سے / خود ان کے دلوں ہی سے / ان کے نفسوں میں سے / اپنے ہی دلوں سے" کی صورت دی گئی ہے۔

● "انفسهم" میں آخری مجرور ضمیر "هم" بمعنی "ان کے" ہے اور "اَنْفُس" بمعنی "جانیں" جمع مکسر ہے' جس کا واحد "نفسٌ" ہے۔ اِس مفرد کلمہ (نفس) اور خود زیر مطالعہ ترکیب (انفسِهم) سے ملتی جلتی ترکیب "انفسَهم" [یعنی صرف "انفس" کی اعرابی حالت کے فرق کے ساتھ] پر البقرہ :۹ [۲: ۸: ۱(۴)] میں مفصل بات ہو چکی ہے۔

● اِس طرح اِس پورے حصہ عبارت (حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ) کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "حسد سے پاس جانوں اپنی کے" یا "حسد کر کر (کرتے ہوئے) اپنے اندر سے"---- جسے بامحاورہ کرتے ہوئے "بسبب اپنے دلی حسد کے / حسد کی وجہ سے جو خود ان کے دلوں ہی سے ہے / اپنے دلی حسد کی وجہ سے / اپنے ہی دلوں کی جلن سے / اپنے دلوں میں حسد رکھ کر / اپنے دل کی جلن سے / حسد کی راہ سے جو ان کے نفسوں میں (ہے)" کی صورت دی گئی ہے۔ ان تمام تراجم میں "انفس" کا ترجمہ "دل / دلوں" سے کرنے کی وجہ یہی ہے کہ اِس میں ایک اندرونی پوشیدہ کیفیت کا ذکر ہے۔ اسی لئے قرآنِ کریم میں "نفوس / انفس (جانوں) صُدور (سینوں) قلوب (دلوں)" کئی مقامات پر قریباً ہم معنی (یا ایک جیسی نفسیاتی کیفیت کے لئے) استعمال ہوئے ہیں۔ بعض تراجم میں لفظ "جو" لانے کی وجہ آگے "الاعراب" میں بیان ہوگی۔

۲ : ٦٦ : ۱(۴) [..... مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ]

❶ "مِنْ بَعْدِ مَا" (پیچھے اِس کے جو / بعد اِس کے کہ / باوجودیکہ / حالانکہ) "مِنْ

بَعْدِ....." تو ابھی اوپر گزرا ہے۔ یہاں "مِنْ بَعْدِ....." کا مضاف الیہ وہ جملہ ہے جو "مَا" سے شروع (ہو کر..... الحق پر ختم) ہوتا ہے۔ اِس سے پہلے یہی ترکیب (مِن بَعدِمَا .....) البقرہ :۷۵ [۲: ۴۷:۱ (۵)] میں زیرِ بحث آ چکی ہے۔ اِس سے "ما" کی مصدریت پر آگے "الاعراب" میں بات ہو گی۔

۳ "تَبَیَّنَ" (ظاہر ہو گیا/ چکا/ کھل چکا/ واضح ہو چکا/ خوب ظاہر ہو چکا) اِس لفظ کا مادہ "ب ی ن" اور وزن "تَفَعَّلَ" ہے۔ یعنی یہ اِس مادہ سے باب تفعُّل کا صیغہ ماضی (واحد مذکر غائب) ہے۔ اِس مادہ سے فعل مجرد کے باب' معنی اور استعمال کے بیان کے علاوہ اِس سے مزید فیہ کے باب تفعیل کے معنی وغیرہ پر بھی البقرہ :۶۸ [۲: ۴۳: ۱ (۶)] میں مفصل بات ہو چکی ہے۔

● "تَبَیَّنَ یَتَبَیَّنُ" کے معنی عموماً تو ہوتے ہیں "ظاہر اور واضح ہو جانا" اور چونکہ باب تفعُّل کی ایک خصوصیت "تکلف' کوشش اور بنانا سنوارنا" بھی ہے اِس لئے اِس فعل کا زیادہ بہتر مفہوم "خوب ظاہر ہو جانا' اچھی طرح واضح ہو جانا" کی صورت میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ جس شخص وغیرہ پر بات واضح ہو جائے اِس کے لئے عربی میں لام (لِ) کا صلہ لگتا ہے' مثلاً کہیں گے "تَبَیَّنَ لَهُ" (اس پر/ کے لئے/ واضح ہو گیا) یعنی اِس کے اردو ترجمہ میں "کے لئے" کی بجائے "پر" لگ سکتا ہے' مگر عربی میں "تَبَیَّنَ عَلَیْهِ" کہنا غلط ہو گا۔

● اوپر ہم نے اِس فعل کے معنی فعل لازم کی صورت میں بیان کئے ہیں' تاہم یہی فعل بطورِ متعدی بھی استعمال ہوتا ہے۔ یعنی یہ فعل "خوب واضح کرنا' ظاہر کرنا" کے معنی بھی دیتا ہے۔ مثلاً کہہ سکتے ہیں "تَبَیَّنَ الشَّیْءُ (چیز واضح ہو گئی) اور "تَبَیَّنَ الشَّیْءَ" (اس نے چیز واضح کر دی)--- بلکہ یہ عجیب بات ہے کہ اس مادہ (ب ی ن) سے فعل مجرد کی ایک صورت [بَانَ یَبِینُ بَیانًا] کے علاوہ اس سے بابِ تفعیل' تفعّل' اِفعال اور استفعال سے بھی فعل لازم اور متعدی دونوں طرح (اور ہم معنی) استعمال ہوتے ہیں' مثلاً کہیں گے بَانَ الشَّیْءُ وَ بَیَّنَ وَ تَبَیَّنَ وَ اَبَانَ وَ اسْتَبَانَ (سب کا مطلب ہے چیز واضح ہو گئی) اور اسی کو بطورِ متعدی یوں بھی کہہ سکتے ہیں۔ بَانَ الشَّیْءَ وَ بَیَّنَهُ وَ تَبَیَّنَهُ وَ اَبَانَهُ وَ اسْتَبَانَهُ (سب کا مطلب ہے "اس نے چیز کو واضح کر دیا") "بَانَ یَبِینُ" اور "بَیَّنَ یُبَیِّنُ" کے متعلق یہی بات (لازم متعدی استعمال والی) البقرہ :۶۸ [۲: ۴۳:۱ (۶)] میں بھی بیان ہوئی تھی۔ بابِ "تفعّل" کی وضاحت یہاں ہو گئی ہے۔ اسی مادے سے بابِ افعال اور استفعال کے استعمال آگے آئیں گے۔

● ثلاثی مجرد والا استعمال قرآنِ کریم میں نہیں آیا مگر مذکورہ بالا مزید فیہ کے چاروں افعال قرآنِ کریم میں استعمال ہوئے ہیں اگرچہ قرآنِ کریم میں اِس مادہ سے بابِ تفعیل اور اِفعال کا زیادہ استعمال بطورِ متعدی اور بابِ تفعُّل اور استفعال کا زیادہ استعمال بطورِ لازم ہوا ہے۔

● اِس فعل (تَبَیَّنَ) کے ایک معنی "کسی بات یا معاملے کی وضاحت کے لئے (جلد بازی کی بجائے ٹھنڈے دل سے) غور و فکر سے کام لینا" بھی ہیں جس کا عام فہم اردو ترجمہ "تحقیق کر لینا' تحقیق سے کام لینا' اچھی طرح تحقیق کر لینا" کی صورت میں کیا جا سکتا ہے۔ یہ استعمال بھی قرآنِ کریم میں متعدد جگہ آیا ہے۔ مزید بات حسب موقع ہوگی۔ ان شاء اللہ۔

● اِس فعل (تَبَیَّنَ) سے مختلف صیغے قرآنِ کریم میں کم و بیش اٹھارہ جگہ آئے ہیں۔ ان میں سے گیارہ جگہ یہ فعل لام کے صلہ کے ساتھ (یعنی جس پر بات واضح ہو اِس کے ذکر کے ساتھ) آیا ہے' باقی مقامات پر عمومی وضاحت (مثلاً سب ہی پر) کے لئے آیا ہے یا "تحقیق کر لینا" کے معنی میں آیا ہے اور کم از کم ایک موقع (سباء :۱۴) پر اس کے لازم متعدی دونوں طرح استعمال کا امکان بھی ہے۔

❸ "لَهُمْ" (ان کے لئے / ان پر) یہ لام الجر + ضمیر جمع غائب (ھم) کا مرکب ہے جس میں ضمیر کی آخری ساکن میم کو آگے ملانے کے لئے ماقبل والی ہائے مضمومہ (ہُ) کی مناسبت سے ضمہ (ـُـ) دیا گیا ہے۔ یہاں لام الجر "لِ" جو ضمیر کے ساتھ آنے کی وجہ سے "لَ" ہوگیا ہے) وہی صلہ ہے جو فعل تَبَیَّنَ کے ساتھ (..... پر واضح ہونا) کے مفہوم کے لئے آتا ہے جس کے لئے یہاں ضمیر "ھُم" ہے جس سے مُراد (مرجع) اہل کتاب کی وہ اکثریت ہے جس کا ذکر شروع آیت میں آیا ہے۔

❹ "الحَقُّ" (حق / سچ) اپنے بہت سے (بنیادی) عربی معانی کے ساتھ یہ لفظ اردو میں اتنا متعارف اور مستعمل ہے کہ اِس کی ترجمہ کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوتی۔ ویسے اِس کے متعلق مفصل لغوی بحث البقرہ :۲۶ [۲:۱۹:۱(۶)] میں گزر چکی ہے۔

● اِس طرح اِس حصہ آیت (مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ) کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "پیچھے / بعد / اِس کے جو کہ ظاہر / واضح ہوگیا ان کے لئے حق) جسے بامحاورہ بناتے ہوئے "بعد اِس کے / اس کے بعد کہ / ظاہر ہو چکا / کھل چکا / ان پر / حق" کی صورت دی گئی ہے۔ بعض نے جملے کی اردو ترتیب و ترکیب کی بناء پر "تَبَیَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ" کے ترجمہ میں "الحَقُّ" کا ترجمہ پہلے اور پھر "لَهُمْ" کا ترجمہ اور آخر پر فعل "تَبَیَّنَ" کا ترجمہ کیا ہے' یعنی بصورت "حق ان پر خوب

ظاہر ہو چکا ہے / (حالانکہ) حق بات ان پر کھل چکی ہے" اور بعض نے اردو جملے کی اسی ترکیب کی بناء پر سب سے پہلے "لَھُمْ" کا ترجمہ اور پھر "الحَقُّ" کا ترجمہ اور بعد میں فعل "تَبَیَّنَ" کا ترجمہ کیا ہے (اُردو کے جملہ فعلیہ میں فعل— فاعل مفعول کے بعد' آخر پر آتا ہے) یعنی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ ترجمہ کو "ان پر حق ظاہر ہو چکا/ واضح ہو چکا ہے" کی صورت دی ہے---- اور ایک ترجمہ "حق واضح ہوئے پیچھے" کی صورت میں کیا گیا ہے۔ اِس میں "لھم" کا ترجمہ نظرانداز ہو گیا ہے اگرچہ مفہوم درست ہے۔

● مندرجہ بالا چار حصہ ہائے عبارت [❶ وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ ❷ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ❸ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ ❹ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ] کا مجموعی ترجمہ (کیونکہ یہ دراصل ایک ہی مربوط طویل جملہ ہے) جزوی فرق کے ساتھ---- عموماً چاروں اجزاء جملہ کی اسی ترتیب کے ساتھ کیا گیا ہے۔ البتہ دو مترجمین نے (غالباً اردو محاورہ کی خاطر) پہلے "كَثِيرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ" کا' پھر "حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ" کا ترجمہ کرنے کے بعد (اردو جملہ فعلیہ کے مطابق) فعل ماضی "وَدَّ" کا ترجمہ (بزمانہ حال) اور پھر اِس کے بعد "لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا" کا ترجمہ کیا ہے۔ یعنی بصورت "اہلِ کتاب سے بہت سے لوگ/ بہت سے اہل کتاب/ دل میں حسد رکھ کر/ اپنے دل کی جلن سے/ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان ہونے کے بعد/ ایمان لا چکنے کے بعد/ پھر تم کو/ تم کو پھر/ کافر بنا دیں۔" اگرچہ اِس ترجمہ کی بڑی وجہ تو اردو محاورہ اور جملے کی اردو ترتیب کا لحاظ ہی ہے' تاہم اِس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کلمہ "حَسَدًا" کا تعلق فعل "وَدَّ" سے ہے یا فعل "يَرُدُّوْنَ" سے؟ لہٰذا اِس پر مزید بات "الاعراب" میں ہوگی۔

● کم از کم ایک مترجم نے "غالباً اردو محاورے کے جوش میں) آیت کے مذکورہ بالا تمام اجزاء کی ترتیب کو اُلٹ پلٹ کر (یعنی پہلے ❶ - وَدَّ پھر ❹ + وَدَّ پھر ❸ اور آخر پر ❷ کرتے ہوئے) ترجمہ یوں کیا ہے "اکثر اہل کتاب/ باوجودیکہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے/ (پھر بھی) اپنے دلی حسد کی وجہ سے/ چاہتے ہیں کہ/ تمہارے ایمان لائے پیچھے پھر تم کو کافر بنا دیں"۔ یہ ترجمہ اردو محاورے کے لحاظ سے بھی اور مفہوم عبارت کو واضح کرنے کے لحاظ سے بھی بہت عمدہ ہے۔ مگر اِس قسم کے ترجمہ کو بین السطور (عربی عبارت کے نیچے) لکھنے سے عام (غیر عربی دان) قاری کو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کس عبارت کا کہاں اور کیا ترجمہ کیا گیا ہے؟---- اِس قسم کے بامحاورہ' رواں اور سلیس (اور آزاد) ترجمہ کے لئے مناسب یہ ہے کہ اصل (پوری) مجموعی عربی

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

May, 1998 Reg. No. CPL. 126

MONTHLY Vol. 17
Hikmat-e-Quran
LAHORE No. 5

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاهور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ــــ اور ــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ــــ اور ــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ ــ اور ــ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصۡرُ اِلَّا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ